ماہنامہ
جہدِ حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

Registered No. CPL-13

جلد نمبر 34... شمارہ نمبر 03... مارچ 2026

ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ

پنجاب میں سی سی ڈی کا کردار

آٹھ ماہ میں 924 افراد پولیس مقابلوں میں جاں بحق

ایچ آر سی پی شکایات سیل

ایچ آر سی پی شکایات سیل نے 1985ء میں کام شروع کیا جب کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں ایسا مخصوص سیل موجود نہیں تھا جو مظلوم لوگوں کی شکایات وصول کرتا ہو۔ اس وقت سے، ایچ آر سی پی پاکستان بھر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔

ایچ آر سی پی شکایت سیل کو ماہانہ سینکڑوں شکایات موصول ہوتی ہیں۔ ہم جو نہی خواتین کے خلاف تشدد، محکمہ جاتی مسائل، اقلیتوں کے حقوق، جبری شادیوں، جبری تبدیلی مذہب، جبری گمشدگیوں، سائبر جرائم اور دیگر تمام انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق شکایات وصول کرتے ہیں اور اس پر ایکشن لیتے ہیں۔ تاہم، مالی معاونت، سیاسی پناہ، جائیداد کے تنازعات یا ذاتی تنازعات سے متعلق شکایات ہمارے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

طریقہ کار

جیسے ہی ہمیں شکایات موصول ہوتی ہیں ہم متعلقہ حکام سے رابطہ کرتے ہیں اور کیس پر کارروائی کا آغاز کر دیتے ہیں۔ ہمارا بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ساتھ ایک براہ راست ریفرل نظام موجود ہے جس کا مقصد شکایت کے فوری ازالے کو یقینی بنانا ہے۔

ہم سے رابطہ کریں

اگر آپ نے کوئی شکایت درج کرانی ہے تو ہمیں کال کر سکتے ہیں، واٹس ایپ کر سکتے ہیں، ای میل بھیج سکتے ہیں یا خط ارسال کر سکتے ہیں۔
آپ اپنے قریبی ایچ آر سی پی شکایات ڈیسک میں بذات خود جا کر شکایت رجسٹر کروا سکتے ہیں اور کمپلینٹ آفیسر سے بذات خود بات کر سکتے ہیں۔

لاہور

ایوان جمہور۔ 107 ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600
فون : +92 42 3586 4994, 3583 8341, 3586 5969
ای۔میل : hrcp@hrcp-web.org
ویب سائیٹ : www.hrcp-web.org
مرکز شکایات سیل
فون : +92 042 3584 5969
موبائل : + 92 0333 200 6800
ای میل: complaints@hrcp-web.org

کراچی

یونٹ نمبر 08، فلور 1
سٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 5 (الاکو ہاؤس)
عبداللہ ہارون روڈ
صدر، کراچی۔ 74400
فون : +92 21 3563 7131, 3563 7132
شکایات سیل (موبائل) : +92 315 111 6287
ای میل : karachi@hrcp-web.org

پشاور

43، گلشن اقبال لین
(نزد ارباب روڈ سٹاپ)
یونیورسٹی روڈ، پشاور
فون : +92 091 584 4253
شکایات سیل (موبائل) : +92 0318 950 0640
ای میل : peshawar@hrcp-web.org

اسلام آباد

آفس B-1، فلور 2
بلاک ڈی-12، (اوپر فیصل بینک)
جی 8، مرکز، اسلام آباد
فون : +92 51 835 1127
شکایات سیل (موبائل) : +92 333 569 4773
ای میل : islamabad@hrcp-web.org

کوئٹہ

فلیٹ نمبر C-6
کبیر بلڈنگ
ایم۔اے جناح روڈ، کوئٹہ
فون : +92 81 282 7869
شکایات سیل (موبائل) +92 306 294 6125
ای میل : quetta@hrcp-web.org

حیدرآباد

306- فائزہ آرکیڈ، (لوفٹ اینڈ میزانائن فلور)
نزد مسجد حاجی شاہ بخاری درگاہ
صدر کنٹونمنٹ، حیدرآباد
فون : +92 22 278 3688, 720 770
فیکس : +92 22 278 4645
شکایات سیل (موبائل) : +92 310 339 2222
ای میل : hyderabad@hrcp-web.org

ملتان

2511/5A ابدالی کالونی
نزد بریٹین سکول
ملتان
فون : +92 61 451 7217
شکایات سیل (موبائل) : +92 331 665 5529
ای میل : multan@hrcp-web.org

گلگت

آفس نمبر 8-9، رانگ ئیل پلازہ
جماعت خانہ روڈ، ذوالفقار آباد کالونی،
جتیال، گلگت
موبائل : +92 0344 547 5553
شکایات سیل (موبائل) : +92 355 454 1088
ای میل : gilgit@hrcp-web.org

تربت/مکران

پرواز ہاؤس،
بالمقابل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
پسنی روڈ، تربت، کیچ
فون : +92 852 413 365
شکایات سیل (موبائل) : +92 323 234 2406
ای میل : turbat@hrcp-web.org

فہرست

پریس ریلیز	03
پنجاب میں سی سی ڈی کا کردار: ایک ماہ میں 924 افراد پولیس مقابلوں میں جاں بحق	04
ماورائے عدالت قتل	06
پنجابی داناؤں کی معدوم ہوتی آوازیں	07
گلگت کی بیٹی کی للکار اور لرزتا ہوا نظام	09
کمسنی کی شادی کے خلاف بل، ایک مثبت قدم، قابل ستائش پیش رفت	10
جہنم کے مکین	11
جلتی ہوئی زندگی	13
پاکستان میں خواجہ سراؤں کے لیے من کی بات کرنے کی محفوظ جگہوں کا قیام	14
25 سال سے کم عمر لوگوں کو درپیش نفسیاتی بحران	16
جوزف فرانسس کی انسانی حقوق کی جدوجہد کا باب بند ہوا	17
ایمان مزاری اور ہادی چٹھہ کی سزاؤں پر انسانی حقوق کے ماہرین کو تشویش	18
مہاجر بچوں کے تحفظ کا مطالبہ	20

ایچ آر سی پی کی رپورٹ سی سی ڈی کی کارروائیوں میں ہونے والی ہلاکتوں کی اعلیٰ سطح کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کرتی ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی جانب سے جاری کی گئی ایک فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ پنجاب میں کرائم کنٹرول ڈیپارٹمنٹ (سی سی ڈی) نے مبینہ مقابلوں کی ایک دانستہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے — جو بہت سے معاملات میں ماورائے عدالت ہلاکتوں پر منتج ہوتی ہے — جو صوبے میں قانون کی حکمرانی اور آئینی تحفظات کو بنیادی طور پر کمزور کرتی ہے۔

ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والی رپورٹس کی بنیاد پر، ایچ آر سی پی نے 2025 کے آٹھ ماہ کے عرصے میں کم از کم 670 سی سی ڈی مقابلوں کو دستاویزی شکل دی ہے، جن میں 924 ملزم ہلاک ہوئے، جبکہ اسی مدت میں صرف دو پولیس اہلکار ہلاک ہوئے۔ ہلاکتوں کا یہ شدید عدم توازن — یعنی اوسطاً روزانہ دو سے زائد جان لیوا مقابلے — اور مختلف اضلاع میں کارروائیوں کے انداز میں یکسانیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ انفرادی بے ضابطگی کے واقعات نہیں بلکہ ایک ادارتی طرزِ عمل ہے۔ چنانچہ، فیکٹ فائنڈنگ مشن نے ان ہلاکتوں پر فوری اعلیٰ سطح کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔

مشن کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پاکستان کے ملکی قوانین اور بین الاقوامی انسانی حقوق سے متعلق ذمہ داریوں کو منظّم انداز میں پامال کیا گیا۔ اگرچہ تشدد اور حراستی اموات (روک تھام و سزا) ایکٹ 2022 ایف آئی کو قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کی زیرِ نگرانی ہر حراستی موت کی تحقیقات کا اختیار دیتا ہے، تاہم مشن کو زیرِ جائزہ واقعات میں اس طریقہ کار پر عمل درآمد کے شواہد نہیں ملے۔ مشن کے زیرِ جائزہ ایک پٹیشن میں عدالت کو ہی ایف آئی اے کو تحقیقات کا حکم دینا پڑا۔ مزید برآں، ان واقعات کی مجسٹریٹ کے ذریعے تحقیقات بھی نہیں کرائی گئیں جو ضابطہ فوجداری کی دفعات 174 تا 176 کے تحت لازم ہے۔ پنجاب حکومت، سی سی ڈی اور پولیس حکام نے مشن کی جانب سے ملاقات کی درخواست کا جواب نہیں دیا جو نہایت افسوسناک ہے، کیونکہ شفافیت کا یہ فقدان انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے معتبر الزامات سے نمٹنے میں ادارتی عدم آمادگی کو ظاہر کرتا ہے۔

مشن نے متاثرین کے خاندانوں میں خوف کے ماحول کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ایک خاندان نے بتایا کہ پولیس اہلکاروں نے ان پر متوفی کو فوراً دفنانے کے لیے دباؤ ڈالا اور خبردار کیا کہ اگر انہوں نے کوئی قانونی کارروائی کی تو ان کے دیگر رشتہ دار بھی مارے جا سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی دھمکیاں مجرمانہ عمل کے زمرے میں آتی ہیں اور انصاف کی راہ میں سنگین رکاوٹ ہیں۔

مشن کے مطابق سی سی ڈی کی کارروائیاں قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کے لیے طاقت اور آتشیں اسلحہ کے استعمال سے متعلق اقوام متحدہ کے ان بنیادی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں، جن کے تحت مہلک طاقت کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب وہ ناگزیر اور متناسب ہو، اور خلاف ورزی کرنے والوں کا احتساب کیا جائے۔ سی سی ڈی کی پریس ریلیز اور ایف آئی آرز میں تقریباً یکساں بیانیہ — کہ ملزمان نے پہلے فائرنگ کی، پولیس نے اپنے دفاع میں کارروائی کی اور ہلاک ہونے والے سنگین جرائم میں ملوث تھے — تقریباً ہر اس کیس میں سامنے آیا جس کا مشن نے جائزہ لیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خودمختار کارروائیوں کی بجائے ایک ترتیب دیا گیا بیانیہ ہے۔

مشن نے نشاندہی کی کہ پائیدار عوامی تحفظ کا حصول ایسے اقدامات کے ذریعے ممکن نہیں جو تفتیش، استغاثہ اور عدالتی احتساب کو نظر انداز کریں۔ دیگر اقدامات کے علاوہ، رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ جامع قانونی حفاظتی انتظامات اور آزاد نگرانی کے نظام کے قیام تک پورے صوبے میں تمام پولیس مقابلوں پر فوری پابندی عائد کی جائے۔ رپورٹ میں یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ ایف آئی اے قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کی زیرِ نگرانی تمام مقابلوں میں ہونے والی ہلاکتوں کی تحقیقات کرے، ایک آزاد سویلین پولیس نگرانی کمیشن قائم کیا جائے، اور مقابلوں میں ہلاک ہونے والے تمام افراد کے خاندانوں کو معاوضہ دیا جائے۔

[پریس ریلیز۔ اسلام آباد۔ 17 فروری 2025]

پنجاب میں سی سی ڈی کا کردار: ایک ماہ میں 924 افراد پولیس مقابلوں میں جاں بحق

ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ

فروری 2025 میں، پنجاب حکومت نے کرائم کنٹرول ڈیپارٹمنٹ (سی سی ڈی) کے قیام کی منظوری دی، جو کہ اپریل 2025 میں باضابطہ طور پر تشکیل دیا گیا اور مئی میں پولیس آرڈر (ترمیمی) ایکٹ 2025 کے تحت اسے قانونی تحفظ فراہم کیا گیا۔ اسے سنگین اور منظم جرائم سے نمٹنے کے لیے ایک خصوصی یونٹ کے طور پر بیان کیا گیا تھا اور اس کی تشکیل کے ساتھ جاری سرکاری پیغامات میں محکمہ کی کارکردگی اور جرائم کی روک تھام میں اس کے اہم کردار پر زور دیا گیا۔ اس تناظر میں، پنجاب حکومت نے اپنے 'محفوظ پنجاب' وژن کا حوالہ بھی دیا تھا۔

تعارف

سی سی ڈی کی تشکیل کے فوراً بعد صوبے بھر میں سی سی ڈی سے منسوب پولیس 'مقابلوں' میں نمایاں اضافہ دیکھا گیا۔ مقابلوں کے واقعات سے وابستہ اموات کی تعداد کو قلم بند کرتے ہوئے، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے تشویش کا اظہار کیا اور اکتوبر 2025 میں کہا کہ سی سی ڈی ایک متوازی پولیس فورس کے طور پر کام کر رہی ہے جسے ایف آئی آر درج کرنے، مشتبہ افراد کو حراست میں لینے اور خطرناک مجرموں کے خلاف سخت کارروائیاں کرنے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں جس کے نتیجے میں قانون کی حکمرانی اور باضابطہ قانونی کارروائی کی آئینی ضمانت شدید متاثر ہوتی ہے۔ سی سی ڈی نے ایچ آر سی پی کے بیان کا جواب دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ مؤخر الذکر کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ سی سی ڈی ماورائے عدالت قتل کر رہی ہے۔

15 اپریل اور 15 دسمبر 2025 کے درمیان، ایچ آر سی پی نے صوبے میں سی سی ڈی کی جانب سے ہونے والے کم از کم 670 مقابلوں کو دستاویزی شکل دی، جس کے نتیجے میں 924 مشتبہ افراد ہلاک ہوئے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں پولیس مقابلوں میں مبینہ طور پر صرف دو پولیس اہلکار ہلاک اور 36 زخمی ہوئے۔

اس طرح کے مقابلوں کی تعداد (اوسطاً، ایک دن میں دو سے زیادہ واقعات)، عام شہریوں اور پولیس اہلکاروں کی ہلاکتوں کا غیر متناسب تناسب، اور ان مقابلوں جڑے حالات کی واضح مماثلت نے میڈیا، مقامی کمیونٹیز اور انسانی حقوق کی تنظیموں میں تشویش پیدا کر دی ہے۔ بہت سے لوگوں نے پولیس مقابلوں کی ضرورت اور قانونی حیثیت کے حوالے سے شدید تحفظات کا اظہار کیا۔ یہ حالات اس امکان کی عکاسی کرتے ہیں کہ ایسے بہت سے واقعات پنجاب کے مختلف اضلاع میں پہلے سے منصوبہ بند یا ماورائے عدالت مقابلوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ قانون کی حکمرانی، باضابطہ قانونی عمل اور منصفانہ ٹرائل، زندگی کے حق کے تقدس اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی معاہدوں کے تحت پاکستان کی ذمہ داریوں کے حوالے سے ان الزامات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے، ایچ آر سی پی نے یہ معلوم کرنے کے لیے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن تشکیل دینے کا فیصلہ کیا کہ آیا پنجاب میں سی سی ڈی کے مقابلے مشتبہ افراد کی گرفتاری کے لیے طے شدہ قانونی طریقہ کار کے مطابق کیے گئے تھے کہ نہیں۔ اس طرح کے واقعات کے طریقہ کار، مقابلوں میں ہونے والی ہلاکتوں کے بعد آزادانہ تحقیقات اور پوسٹ مارٹم کے طریقہ کار کی حیثیت، اور عدالتی نگرانی کے دائرہ کار کا جائزہ لینا بھی اس مشن کے مقاصد میں شامل تھا۔ مشن کا مقصد یہ معلوم کرنا بھی تھا کہ آیا یہ طرز عمل پاکستان کے ملکی قوانین اور انسانی حقوق کی بین الاقوامی ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے زمرے میں تو نہیں آتا ہے اور، اگر آتا ہے تو پھر ایسے اقدامات تجویز کیے جائیں جن سے ان واقعات کی روک تھام ہو سکے اور متاثرین کو انصاف مل سکے۔

مشن میں ایچ آر سی پی پنجاب چیپٹر کے وائس چیئر مین راجہ اشرف، ایچ آر سی پی کی ڈائریکٹر فرح ضیاء، سٹاف ممبران ماہین پراچا اور علی حیدر اور صحافی عمران گبول شامل تھے۔ مشن کے اجلاس اور فیلڈ وزٹ 22 سے 23 دسمبر 2025 کے درمیان کیے گئے۔

مشن کے مشاہدات

مشن کے اہم مشاہدات ذیل میں بیان ہیں:

مقابلوں کا وسیع تر دائرہ کار اور یکسانیت، اور اضلاع میں آپریشنل مماثلتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ پولیس مقابلے ادارہ جاتی روش اور مرکزی پالیسی کے باعث کیے گئے نہ کہ انفرادی افسران کی بدانتظامی اور صوابدید کی بنا پر۔

☆ مقابلوں کے نتیجے میں ہونیوالی ہلاکتوں میں شدید عدم توازن کی نشاندہی ہوئی ہے: ذرائع ابلاغ سے جمع کیے گئے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ آٹھ ماہ کے دوران صرف دو پولیس اہلکار جبکہ 924 مشتبہ افراد مارے گئے۔ حقیقی مسلح تصادم میں، ایسا تناسب شماریاتی طور پر ناقابل تصور معلوم ہوتا ہے۔ یہ عدم توازن مشتبہ افراد کو دانستہ قتل کرنے اور زندگی کے تقدس سے لاپرواہی برتنے کے مترادف ہے۔

☆ مشن نے جن تمام واقعات کا جائزہ لیا ان سب میں تقریباً یہی بیانیہ سامنے آیا کہ 'مشتبہ افراد نے پہلے فائرنگ کی'، 'پولیس نے اپنے دفاع میں کارروائی کی'، اور یہ کہ 'مجرم سنگین جرائم میں ملوث تھے'۔ سی سی ڈی کی پریس ریلیزوں میں اسی ایک جیسے بیانیے کی جھلک ملتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سی سی ڈی واضح طور پر میڈیا میں اس طرح کے مقابلوں کی مسلسل پریس کوریج کا پرچار کرنا چاہتی ہے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ ہر مقابلے کے بعد اپنی مرضی کی معلومات صحافیوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر شیئر کی جائیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا مقصد 'مجرموں' کے علاوہ عام عوام میں خوف پیدا کرنا ہے جبکہ ساتھ ساتھ یہ تاثر بھی پیدا کرنا ہے کہ صوبے کو جرائم سے پاک کرنے کے لیے بڑی مستعدی اور اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔

☆ ٹارچر اینڈ کسٹوڈیل ڈیتھ (روک تھام اور سزا) ایکٹ 2022 کے تحت، ہر ایک زیر حراست موت کی تحقیقات ایف آئی اے کے ذریعے این سی ایچ آر کی نگرانی میں ہونی چاہیے۔ تاہم، مشن کو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ زیادہ تر واقعات میں اس لازمی طریقہ کار کی پیروی کی گئی ہو۔ مزید برآں، حکام نے اس معاملے پر مشن سے بات نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مقتولین کے اہل خانہ نے اطلاع دی کہ پولیس نے واقعہ کے بعد خود وقوعے کی رپورٹس تیار کیں، ریاست کے ایماء پر ایف آئی آر درج کیں، اور اندرونی پوچھ گچھ کی، اس طرح قانون کی براہ راست خلاف ورزی کی گئی۔

☆ مشن اس بات کا تعین کرنے سے قاصر تھا کہ آیا سی آر پی سی (سیکشن 174 تا 176) کی دفعات کے تحت کوئی عدالتی انکوائری ہوئی تھی یا کوئی انکوائری رپورٹ حاصل کی گئی تھی۔

☆ اگرچہ ایچ آر سی پی نے پولیس مقابلوں کے بارے میں معلومات لینے کے لیے پنجاب پولیس کے پبلک انفارمیشن آفیسر کے پاس درخواست دائر کی ہے تاہم اس رپورٹ کے جاری ہونے تک اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

☆ صحافی اور کرائم رپورٹرز پہلے سے طے شدہ مقابلوں کے خلاف قانونی تحفظات سے واضح طور پر ناواقف تھے اور نہ ہی انہوں نے سی آر پی سی (دفعات 174 تا 176) کے تحت درکار عدالتی انکوائریوں کے متعلق معلومات لینے یا ٹارچر اینڈ کسٹوڈیل ڈیتھ (روک تھام اور سزا) ایکٹ 2022 کے تحت ایف آئی اے کے کردار کی جانچ پڑتال کے لیے کوئی سنجیدہ تحقیقات کیں۔

☆ پولیس مقابلوں کے متاثرین کے خاندانوں میں خوف کی فضا برقرار ہے، جن کا کہنا تھا کہ پولیس حکام کی جانب سے میت کو فوری طور پر دفنانے کے لیے ان پر دباؤ ڈالا گیا تھا۔ طبی معائنے میں تاخیر یا ایسے معائنوں کے دوران آزاد مبصرین کی غیر موجودگی کی اطلاعات بھی ملیں؛ اور تشدد کی دھمکیاں دی گئیں یا تنبیہ کل گئی کہ اگر خاندان اپنے مؤقف پر قرار رہا تو دیگر رشتہ داروں کو بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی دھمکیاں انصاف کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں اور مجرمانہ طرز عمل کو تشکیل دیتی ہیں۔

☆ صحافیوں اور وکلاء نے یہ بھی نوٹ کیا کہ پولیس مقابلوں کا کلچر ادارہ جاتی بدعنوانی کو ہوا دیتا ہے: چھاپوں کے دوران جائیداد ضبط کرنے، گرفتاری سے بچنے کے لیے رشوت، اور مجرمانہ ریکارڈ میں ہیرا پھیری کے الزامات سامنے آئے ہیں۔

☆ پولیس مقابلے میں ہونے والی ہلاکت کی خودکار، آزاد تحقیقات کو یقینی بنانے کے لیے ایک جامع عدالتی طریقہ کار کی عدم موجودگی مؤثر نگرانی اور احتساب کو متاثر کرتی ہے۔

☆ قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کے ذریعہ طاقت اور آتشیں اسلحے کے استعمال سے متعلق اقوام متحدہ کے بنیادی اصولوں کا تقاضا ہے کہ مہلک طاقت بالکل ضروری اور متناسب ہو، اور یہ کہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جوابدہ ٹھہرایا جائے۔ مشن کے مشاہدے میں آیا ہے کی سی سی ڈی آپریشنز میں ان میں سے کوئی بھی شرط پوری نہیں ہوئی ہے۔

ماحصل

سی سی ڈی کی کارروائیوں کے جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ پولیس مقابلوں پر مبنی پولیسنگ ماڈل جو کہ اس وقت نافذ العمل ہے بنیادی طور پر قانون کی حکمرانی اور آئینی تحفظات کو کمزور کرتا ہے۔ جب ریاست مشتبہ افراد کو بغیر مقدمہ چلائے قتل کرتی ہے، تو وہ عدالتوں کو غیر متعلقہ بنا دیتی ہے، قانون نافذ کرنے والے افسران کو جلاد میں تبدیل کر دیتی ہے اور آئین کے آرٹیکل 10 الف کے تحت منصفانہ ٹرائل کے حق کی نفی کرتی ہے۔ یہ عمل نہ صرف آرٹیکل 9 میں درج زندگی کے حق کی خلاف ورزی کرتا ہے بلکہ باضابطہ قانونی کارروائی کے پورے فریم ورک، بے گناہی اور عدالتی نگرانی کے مفروضے کو بھی ختم کرتا ہے جو کہ فعال جمہوریت کی بنیاد ہوتی ہے، اس طرح افراد اور کمیونٹیز کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ مجموعی طور پر، عدالتی ڈھانچہ اور خود فوجداری نظام انصاف کھوکھلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ درحقیقت، جرائم کی روک تھام کے لیے وقتی حل ڈھونڈنے سے پائیدار عوامی تحفظ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے تفتیش، استغاثہ اور عدالتی احتساب بھی نظر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح مشن یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ سی سی ڈی کے مقابلوں کے طریقے قانون اور آئین کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتے ہوئے ماورائے عدالت قتل کی ایک منظم پالیسی تشکیل دیتے ہیں۔ ان کارروائیوں کا دائرہ کار، تواتر اور ادارہ جاتی تحفظ پنجاب میں آئینی طرز حکمرانی کے نقص کو ظاہر کرتا ہے۔

مشن کو سخت مایوسی ہوئی ہے کہ متعلقہ حکام سے ملاقات (جس سے قانونی طریقہ کار کی تعمیل پر کچھ وضاحت مل جاتی) کی متعدد درخواستوں کے باوجود مشن کو جواب نہیں ملا۔ اس حوالے سے حق معلومات کے قانون کے تحت ایک درخواست بھی جمع کروائی گئی۔ شفافیت اور جوابدہی کا یہ فقدان بذات خود نظام کی خرابی کی شہادت ہے۔

آزادانہ تحقیقات، ذمہ داروں کے احتساب، اور آئینی اور بین الاقوامی انسانی حقوق کے معیارات کی تعمیل کو یقینی بنانے کے لیے فوری اصلاحات لائی جائیں۔ ریاستی تشدد کو معمول کا درجہ دینے سے پاکستان کے قانونی نظام، اس کے جمہوری اداروں اور بین الاقوامی برادری میں اس کے موقف کو مستقل طور پر نقصان پہنچے گا۔

سفارشات

اپنے نتائج کی بنیاد پر، مشن پنجاب حکومت، متعلقہ صوبائی اور وفاقی حکام اور عدلیہ کو درج ذیل سفارشات پیش کرتا ہے۔

☆ سی سی ڈی کے مقابلوں میں آٹھ مہینوں میں 900 سے زائد افراد کی ہلاکت کی اعلیٰ اختیاراتی عدالتی انکوائری ہونی چاہیے۔

☆ پنجاب حکومت کو فوری طور پر صوبے بھر میں سی سی ڈی اور دیگر پولیس یونٹس کے ذریعے کیے جانے والے تمام پولیس مقابلوں پر اس وقت تک مکمل پابندی کا اعلان کرنا چاہیے جب تک کہ جامع قانونی تحفظات، نگرانی کا آزادانہ طریقہ کار اور احتساب کا فریم ورک قائم نہیں ہو جاتا۔

☆ پولیسنگ کی تمام کارروائیاں آئینی دفعات، سی آر پی سی اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات کے مطابق انجام دی جانی چاہئیں۔ مہلک قوت کا استعمال صرف اس صورت میں کیا جانا چاہیے جب بالکل ضروری اور متناسب ہو۔

☆ ٹارچر اور کسٹوڈیل ڈیتھ (روک تھام اور سزا) ایکٹ 2022 کی تعمیل میں، ایف آئی اے کو این سی آر سی نگرانی میں پولیس مقابلوں سے متعلق تمام اموات کی آزادانہ تحقیقات شروع کرنی چاہیے۔ یہ تحقیقات ایسے افسران کے ذریعے کی جائیں جن کا پنجاب پولیس سے کوئی ادارہ جاتی تعلق نہیں اور اس میں جرائم کے تمام حالات و واقعات کی فرانزک جانچ، سائنسی تجزیہ، آزاد پوسٹ مارٹم رپورٹس، گواہوں کی شہادتیں اور پیش رفت کی سہ ماہی رپورٹس شامل ہونی چاہئیں۔

☆ ایسے تمام پولیس افسران، بشمول سینئر کمانڈرز جو ایسے انکاؤنٹر آپریشنز میں براہ براست ملوث ہیں جن میں قانونی طریقہ کار کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوا ہے، انہیں تحقیقات مکمل ہونے تک فوری طور پر معطل کیا جائے۔ زیر تفتیش کسی افسر کو جاری تفتیش پر اثر انداز ہونے یا شواہد یا گواہوں تک رسائی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

☆ پنجاب حکومت کو قانون سازی کے ذریعے، آئینی تحفظ، بجٹ کی خودمختاری، مکمل تفتیشی اختیارات اور سول سوسائٹی، قانونی ماہرین، انسانی حقوق کی تنظیموں اور ریٹائرڈ ججوں کی نمائندگی پر مشتمل ایک آزاد سویلین پولیس نگران کمیشن قائم کرنا چاہیے۔ کمیشن کو از خود تحقیقات شروع کرنے، تمام پولیس ریکارڈ تک رسائی، افسران کو طلب کرنے، قانونی چارہ جوئی کی سفارش کرنے اور طاقت کے استعمال کے تمام واقعات کا لازمی جائزہ لینے کا اختیار ہونا چاہیے۔

☆ پولیس کے تمام آپریشنز جن میں طاقت کا ممکنہ استعمال شامل ہو، کو تمام شریک افسران کی طرف سے جسم سے پہنے ہوئے کیمروں کا استعمال کرتے ہوئے ریکارڈ کیا جانا چاہیے، فوٹیج خود بخود ایک محفوظ ڈیجیٹل اسٹوریج میں اپ لوڈ ہو جائے جو عدالتی حکام اور نگران اداروں کے لیے قابل رسائی ہو۔ کیمروں کو چالو کرنے میں ناکامی یا فوٹیج کے ساتھ چھیڑ چھاڑ پر تادیبی اور فوجداری کارروائی ہونی چاہیے۔

☆ پنجاب حکومت کو جسمانی تحفظ، نقل مکانی میں مدد، قانونی امداد، نفسیاتی معاونت، اور مالی امداد فراہم کرنے کے لیے گواہان اور متاثرہ خاندانوں کے تحفظ کا جامع پروگرام وضع کرنا چاہیے تاکہ متاثرہ خاندان انتقامی کارروائی کے خوف کے بغیر انصاف حاصل کر سکیں۔ گواہوں اور خاندانوں کو ڈرانا، ہراساں کرنا، یا دھمکایا جانا ایک الگ مجرمانہ جرم سمجھا جانا چاہیے۔

☆ پنجاب حکومت کو انسانی حقوق کے قانون میں مہارت رکھنے والے پراسیکیوٹرز کے عملہ کے لیے وقف خصوصی پراسیکیوشن یونٹ قائم کرنے چاہیں، جو ادارہ جاتی طور پر باقاعدہ پراسیکیوشن سروسز سے الگ ہوں، اور ماورائے عدالت قتل، حراست میں ہونے والی اموات اور تشدد کے مقدمات کی تفتیش اور پراسیکیوشن کے لیے کام کریں۔ ان یونٹس کو مناسب وسائل کے ساتھ ساتھ سیکورٹی، تربیت اور براہ راست تحقیقات کا اختیار بھی فراہم کیا جانا چاہیے۔

☆ پنجاب حکومت کو فروری 2025 سے انکاؤنٹر آپریشنز میں ہلاک ہونے والے تمام افراد کے لواحقین کے لیے ایک جامع معاوضہ سکیم قائم کرنی چاہیے۔ انہیں مالی مدد، قانونی اخراجات کی ادائیگی کی جائے اور ان کے نقصان کا عوامی اعتراف کیا جائے قطع نظر اس کے کہ تحقیقات کے نتائج کیا نکلتے ہیں، اور متاثرہ خاندانوں پر کارروائی کے حق سے دستبردار ہونے کے لیے دباؤ نہ ڈالا جائے۔

ماورائے عدالت قتل

ڈاکٹر توصیف احمد خان

انسانی حقوق کی پاسداری کے لیے جدوجہد کرنے والی غیر سرکاری تنظیم انسانی حقوق کمیشن پاکستان (H.R.C.P) نے پنجاب میں قانون نافذ کرنے والی ایجنسی کے ہاتھوں ماورائے عدالت قتل کے بڑھتے ہوئے واقعات پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ایچ آر سی پی نے پنجاب میں ماورائے عدالت قتل کی وارداتوں کی تحقیقات کے لیے ایک فیکٹ فائنڈنگ کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پنجاب کے کرائم کنٹرول ڈپارٹمنٹ سی سی ڈی نے گزشتہ سال کے آٹھ ماہ کے دوران 670 ماورائے عدالت انکاؤنٹرز کیے۔ ان وارداتوں میں مبینہ طور پر کم از کم 924 افراد مارے گئے اور ان کارروائیوں میں صرف 2 پولیس افسر جاں بحق ہوئے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سی سی ڈی کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوسطاً روزانہ دو انکاؤنٹر ہوئے جن سے یہ واقعات Isolodate Incidents کے بجائے Institutional Practise نظر آتے ہیں۔ اس رپورٹ میں عینی شاہدوں کے بیانات ریکارڈ کیے گئے۔ ایک عینی شاہد جس کا قریبی عزیز پولیس انکاؤنٹر میں مارا گیا نے کمیشن کے ارکان کو بتایا کہ پولیس نے اس شرط پر ہلاک ہونے والے شخص کی لاش حوالے کی تھی کہ لواحقین لاش کو خاموشی سے دفنا دیں گے اور کسی قسم کا احتجاج نہیں کریں گے۔ اس رپورٹ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ پولیس کی ایف آئی آر اور پولیس کی پریس ریلیز ایک ہی ہوتی ہے۔ اس طرح کی پریس ریلیز میں پولیس اپنے دفاع میں گولی چلانے کی دلیل دیتی ہے اور لکھا جاتا ہے کہ پہلے ملزمان نے پولیس پر گولی چلائی اور مرنے والے بدنام مجرم تھے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کے جاری کردہ بہت سے پریس ریلیز میں تو یہ تک کہا جاتا ہے کہ پولیس ملزم کو اسلحہ کی برآمدگی اور دیگر ملزمان کی گرفتاری کے لیے لے کر جا رہی تھی کہ ملزمان کے ساتھیوں نے حملہ کیا۔ حملہ میں ان کا ساتھی ہلاک ہوگیا۔

یہ بھی مشاہدہ میں آیا ہے کہ جنسی جرائم میں ملوث ملزموں کے نینے میں رکھی ہوئی پستول اچانک چل جاتی ہے اور ملزم ہلاک ہو جاتا ہے۔ ایچ آر سی پی کی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ Torture and custodial death prevention punishment act and 2022 کے تحت ہر اس طرح کے پولیس مقابلہ کی ایف آئی اے کو تحقیقات کرنی چاہئے اور حکومت پاکستان کے قائم کردہ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (N.C.H.R) کو اس تحقیقات کی نگرانی کرنی چاہئے مگر تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ ہی اس طرح کے معاملہ کی ایف آئی اے سے تحقیقات کرائی گئی نہ NCHR کو اس معاملہ میں مداخلت اور نگرانی کا موقع ملا۔ اس رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ اس طرح کے مبینہ پولیس مقابلوں کی تحقیقات کے لیے Code of criminal procedure کی دفعات 174 اور 176 کے تحت اس طرح کے واقعات کی تحقیقات کے لیے مجسٹریٹ سے تحقیقات کرانا ضروری ہے مگر کسی بھی مقدمہ میں مجسٹریٹ سے تحقیقات نہیں کرائی گئیں۔ اس رپورٹ میں واضح کیا گیا ہے کہ پنجاب میں سی سی ڈی کی یہ کارروائیاں نہ صرف پاکستان کے آئین بلکہ اقوام متحدہ کے طاقت کے استعمال کے بنیادی اصولوں خاص طور پر Use of force and firearms by law enforcement officers کی واضح خلاف ورزی ہے۔

اس رپورٹ میں پنجاب حکومت پر زور دیا گیا ہے کہ فوری طور پر پولیس کو اس طرح کے ماورائے عدالت قتل جیسے واقعات سے روکا جائے اور جو پولیس افسران ان غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں ان کے خلاف فوجداری قوانین کے تحت کارروائی کی جائے۔ اس رپورٹ میں شامل چارٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ پولیس نے سب سے زیادہ ڈکیتی کے 273 مقدمات میں ملوث 366 مبینہ ملازموں کو ہلاک کیا۔ اس طرح منشیات کے کاروبار کے متعلق 61 پولیس مقابلوں میں 114 مبینہ ملزمان ہلاک ہوئے، ریپ کے 17 مقدمات میں 20 ملزمان اور راہزنی کے 111 مقدمات میں 138 ملزمان اور بغیر کسی اطلاع کے 112 مقدمات میں 133 مبینہ ملزمان کی ہلاکت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایچ آر سی پی کی یہ فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ قانون پر یقین رکھنے والے شہریوں کے لیے ایک بہت بڑا دھچکہ ہے۔ بھارت اور پاکستان میں ماورائے عدالت قتل اور پولیس انکاؤنٹر کی ایک بڑی تاریخ ہے۔ اس موضوع پر لاتعداد فیچرز، آرٹیکلز اور ایڈیٹوریلز کے علاوہ ڈاکیومنٹریز اور فیچر فلمیں بن چکی ہیں۔ پولیس حکام کا کہنا ہے کہ ملک کا عدالتی نظام ناقص ہے۔ اس نظام میں حقیقی ملزموں کو بہت کم سزائیں ہوتی ہیں اور اگر بھیا تک جرائم میں ملوث ملزمان پکڑے جاتے ہیں تو کوئی ان کے خلاف عدالتوں میں گواہی نہیں دینے جاتا، یوں یہ انسانیت کے خلاف جرائم کرنے والے ملزمان چند سال جیلوں میں گزارنے کے بعد رہا ہو جاتے ہیں اور جرائم کی شرح کم نہیں ہو پاتی۔ اس بناء پر جرائم کی شرح کم کرنے کے لیے اس طرح کا طریقہ کار اختیار کرنا مجبوری بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں اس طریقہ کار پر کامیابی سے عمل ہو رہا ہے۔ پولیس حکام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پنجاب میں یہ طریقہ کار اختیار کرنے کے بعد جرائم کی شرح کم ہوتی ہے۔ پنجاب کے علاوہ دیگر صوبوں میں بھی پولیس اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اسی طریقہ کار کو اختیار کرتی ہیں۔ اندرون سندھ ڈاکوؤں کے خاتمہ کے لیے ملزموں کو ہاف فرائی اور فل فرائی بنانے کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ بلوچستان میں پولیس اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں بلوچ سرمچاروں کے حامیوں کو چن چن کر نشانہ بنا رہی ہیں مگر پولیس کی ان کارروائیوں کے باوجود جرائم کی شرح کم ہوتی نظر نہیں آتی۔ عدالتی فیصلوں کے بجائے پولیس کا ماورائے عدالت قتل معاشرہ میں نئے تضادات کو ابھار دیتا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پولیس کے نظام میں کرپشن کی جڑیں بہت گہری ہیں جس کی بناء پر پولیس کے دعووں کی صداقت ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے۔ اخبارات کی فائلوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جعلی پولیس مقابلے پولیس کے کلچر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پولیس افسران ذاتی مقاصد کے لیے کسی فرد کو انٹروگیٹ کرتے ہیں اور جب یہ بے گناہ افراد بھاری رقم ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں تو پھر پولیس انہیں ہلاک کر دیتی ہے۔ گزشتہ اکتوبر میں لاہور کے ایک ڈان خواجہ طریف بٹ عرف طیفی بٹ جو کہ امیر بالاج ٹیپو کے قتل میں ملوث تھا اسے دبئی سے بذریعہ جہاز کراچی لایا گیا اور کراچی سے اسے پنجاب پولیس کار میں بٹھا کر لاہور لے جا رہی تھی۔ اس ملزم کو رحیم یار خان کے قریب پولیس مقابلہ میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس وقت پولیس نے یہ بیانیہ اختیار کیا تھا کہ ملزم کے ساتھیوں نے طیفی بٹ کو رہا کرانے کے لیے فائرنگ کی تھی۔ پولیس نے جوابی فائرنگ کی اور اس فائرنگ میں طیفی بٹ ہلاک ہوگیا۔ نامعلوم حملہ آوروں کا کچھ نہیں بگڑا نا ہی پولیس پارٹی میں سے کوئی زخمی ہوا تھا۔ طیفی کے اہل خانہ نے پولیس کے اس موقف کو مسترد کر دیا تھا اور اس واقعہ کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا مگر کچھ نہیں ہوا۔ 90ء کی دہائی میں حیدر آباد کے قصبہ میں پولیس نے کارروائی کر کے ایک خاندان کے 8 افراد کو ایک رینجرز مقابلہ میں شہید کر دیا تھا۔ رینجرز نے پریس ریلیز میں مرنے والے افراد کو بھارت کا ایجنٹ قرار دیا تھا اور ملزمان کے پاس سے بھاری اسلحہ اور قیمتی غیر ملکی کرنسی کی برآمدگی کا بھی اعلان ہوا۔ بعد میں صحافیوں کی تحقیقات سے سرکاری مؤقف غلط ثابت ہوا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ مرنے والے افراد کو زمین کے تنازع پر قتل کیا گیا۔ ان افراد کا کسی بھی طور پر بھارت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جو اسلحہ پیش کیا گیا ان میں سے بھارت کے نام کے جعلی لیبل لگائے گئے تھے۔ ایک فوجی افسر کو فوجی عدالت نے سزائے موت دی گئی اور اس فیصلہ پر عملدرآمد ہوا۔

آئین اور قانون سے ہٹ کر ہونے والے اقدامات زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔ اس روایت سے معاشرہ پر قانون کی گرفت کمزور ہوتی ہے اور عوام کا ریاستی اداروں پر سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ پنجاب پولیس نے اس غیر قانونی اقدام کے طریقہ کار کو اپنا کر پورے معاشرہ میں ایک منفی روایت کو جنم دیا ہے۔ یہ روایت اداروں کی اہمیت کم کر رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نیا عدالتی نظام ترتیب دیا جائے۔ گواہ کے معاوضہ اور تحفظ کے لیے قانون سازی کی جائے۔ اس طرح Faceless عدالتیں بھی قائم ہو سکتی ہیں جہاں پر فوری طور پر مقدمات کی سماعت ہو کر ملزمان کو کیفر کردار پر پہنچایا جا سکتا ہے مگر کسی معاشرہ میں کسی فرد یا ادارہ کو ماورائے عدالت قتل کا لائسنس دینے کا مطلب معاشرہ کو قبائلی نظام کی طرف لے جانا ہے۔

پنجابی داناؤں کی معدوم ہوتی آوازیں

علی حیدر

شہری پنجاب میں پنجابی زبان اور ثقافت زوال پزیر ہے

یہ ایک ایسی تہذیب کی کہانی ہے جو آہستہ آہستہ اپنی تال کھو رہی ہے، خاص طور پر اپنی شاعری، فلسفہ اور تکثیری قلب۔ بزرگ صوفی مقامی حکمت سے مالا مال روایات اور لوک داستانوں کے ورثے کی نگہبانی کر رہے ہیں جبکہ شہری نوجوان عالمی سرمایہ داری سے ہم آہنگ رہنے کے لیے اپنے ورثے کو ترک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب پنجابی ہی پنجاب کی فکر نہیں کریں گے تو پھر کون کرے؟

قصور کی گلیوں میں چلتے ہوئے، جہاں بلھے شاہ کے مقبرے کے مینار کہرے میں چمکتے دکھائی دیتے ہیں، محبت، مزاحمت اور تصوف کی دھندلی بازگشت سننے کو ملتی ہے۔ ایک مقامی صوفی کا کہنا ہے کہ ''فقیر دا کوئی دین، مذہب نہیں ہوندا (صوفی کا کوئی دین یا مذہب نہیں ہوتا)، اس کی نظریں مزار کے صحن پر جمی ہوئی تھیں جہاں کبھی تمام عقائد کے زائرین نے شانہ بشانہ دعا کی تھی۔

جس خطے میں وارث شاہ نے ہیر کا اپنا ورژن لکھا اور بُلھے شاہ نے عشقِ الٰہی کا گیت گایا، وہاں ایک زمانے میں پروان چڑھنے والی زبان اب خاموشی سے مرتی نظر آتی ہے۔ مقامی شناخت کی موسیقی جو کبھی ہر گاؤں میں سنی جاتی تھی اب جدید شہری زندگی کے شور کے نیچے زندہ رہنے کی جدوجہد سے دوچار ہے۔

نئی تعمیر شدہ شیخوپورہ تا لاہور شاہراہ پر وارث شاہ کے مقبرے کی طرف روانہ ہوتے ہوئے، آپ زمینی منظرنامے میں تبدیلی کا مشاہدہ کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ وسیع و عریض علاقوں میں سرسبز میدانوں کی جگہ کنکریٹ، صنعت اور گرد آلود لے رہی ہے۔ جہاں پیپل کے درخت کبھی مسافروں کو سایہ فراہم کرتے اور تاحد نگاہ کھیت نظر آتے تھے وہاں اب صنعتی پلازے اور ہاؤسنگ کالونیاں کھڑی ہیں۔

شہری پھیلاؤ نے پوری بستیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے، سماجی بندھنوں کو ختم اور زرعی معیشتوں کو تباہ کر دیا ہے جو کبھی دیہی پنجاب کی بقا کا ذریعہ تھیں۔ وارث شاہ کے دربار کی پُرسکون دیواروں کے اندر، مقامی صوفی اب بھی محبت، مساوات اور انسانیت کے احترام کا پرچار کرنے والا کلام پیش کرتے ہیں— ختم ہوتے ہوئے تمدن کی باقیات۔

وارث شاہ کے مزار کے نگران سید اصغر حسین اور سید میثم کہتے ہیں کہ جب وہ اپنے آباء کی دہلیز سے گزرتے ہیں تو "ہر کوئی عقیدت مند ہے؛ تمام فرقے اور ذاتیں بڑی انسانیت کا حصہ ہیں۔" یہ اچھا ہے کیونکہ وارث شاہ اور بلھے شاہ دونوں نے مذہب کے بارے میں ان الفاظ میں بات کی جو عام لوگوں کی سمجھ میں آتے تھے اور مقامی ثقافت سے ہم آہنگ تھے۔ کیا یہ سچ ہے کہ پنجاب کی نسلی و مذہبی شناخت سے انحراف خطے کے کچھ حصوں کو بنیاد پرست بنانے کا ذمہ دار ہے؟

وارث شاہ کے مزار پر، عمر رسیدہ عقیدت مند چار زانوں بیٹھے ہیں، کلام پڑھتے ہوئے ان کی آوازیں کانپ رہی ہیں۔ اصغر حسین کہتے ہیں، ''یہاں اب کوئی ہیر کو سمجھنے نہیں آتا۔" وہ سیلفی کے لیے آتے ہیں، نہ کے سماع (روحانی کلام سننے) کے لیے۔" وہ کہتے ہیں کہ چار صدیاں پہلے وارث شاہ نے ہیر کے ذریعے پنجاب کی ثقافت کو منفرد بنا کر، عورت کے نقطہ نظر سے رومانوی اظہار کی تصویر کشی کی، اور ساتھ ہی اسے فلسفیانہ صورت دی اور یہ پنجاب کی روحانی ماحولیات اور باہمی وجود کا عکاس بھی ہے۔ بلھے شاہ کے مزار پر ایک عقیدت مند نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "اب کوئی بھی یہ زبان نہیں بولتا"۔

تنوع سے بٹوارے تک

تاریخ وہ ہے جس سے پنجابی سب سے زیادہ خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ ان کے تاریخ کے مطالعہ پر نوآبادیاتی حکمرانوں کی طرف سے پیدا کیے گئے غلط تصوراتی نظریاتی نقطہ نظر کا غلبہ ہے۔ مجھے تاریخ پنجابی شناخت کی ایک الگ کہانی سناتی ہے۔ تصوف، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، اس کی ثقافت کا جوہر تھا۔ وادیِ سندھ، اپنے دریاؤں اور لوک داستانوں کے ساتھ، ہمیشہ گنگا تہذیب سے الگ رہی ہے۔ اس کی روایات نے صوفی اسلام، بدھ مت کی ہمدردی کے فلسفے اور مقامی حکمت کے منفرد مجموعے سے جنم لیا تھا۔ اس ثقافت کو نوآبادیاتی طرزِ حکمرانی میں شدید دھچکا لگا۔ 1947 میں تقسیم کے بعد، ہندوستان اور پاکستان نے مرکزی لسانی پالیسیاں نافذ کیں جن کے ذریعے اردو اور ہندی کو زبان کا درجہ دیا گیا۔ ان پالیسیوں نے پنجابی کو اپنے ہی وطن میں تن تنہا چھوڑ دیا۔ مقامی تعلیمی نظام کو تبدیل کرنے اور مقامی فن اور صنعت کو تباہ کرنے کی نوآبادیاتی کوششیں 1849 سے ثقافتی اور سماجی اقتصادی ڈھانچے کو پہلے سے ہی متاثر کر رہی تھیں۔

موجودہ نسل اپنے بین المذاہب ہم آہنگی، مساوات کے اصولوں اور ماحولیات کے حوالے سے شعوری عمل کو ترک کرنے والے معاشرے کی گواہ ہے۔ ان بنیادی اقدار نے مذہبی اور نسلی شمولیت کو فروغ دیا تھا۔ بلھے شاہ کے مزار پر موجود ایک عقیدت مند نے کہا، "پنجابی المیہ، محبت اور انسانیت پر مشتمل ہے۔"

پاکستان کی تقریباً 37 فیصد آبادی کی زبان ہونے کے باوجود، پنجابی گھروں اور دلوں سے مٹ رہی ہے۔ مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق، 1951 میں پنجابی بولنے والوں کی تعداد 57 فیصد تھی جو 2023 میں کم ہو کر 36.98 فیصد رہ گئی ہے۔ یہ ایک تشویشناک کمی ہے۔ یونیسکو نے متنبہ کیا ہے کہ زبان کے نقصان کا مطلب مقامی علم کا ضیاع ہے یعنی کہ لوک داستان، ماحولیات اور مقامی اجتماعی یادداشت کا ضیاع۔

مزارِ خاموشاں

وارث شاہ کے مزار پر، عمر رسیدہ عقیدت مند چار زانوں بیٹھے، لڑکھڑاتی آواز سے کلام پڑھ رہے ہیں۔ اصغر حسین کہتے ہیں، ''یہاں اب کوئی ہیر کو سمجھنے نہیں آتا۔" وہ سیلفی کے لیے آتے ہیں، نہ کے سماع (روحانی کلام سننے) کے لیے۔" وہ کہتے ہیں کہ چار صدیاں پہلے وارث شاہ نے ہیر کے ذریعے پنجاب کی ثقافت کو منفرد بنا کر، عورت کے نقطہ نظر سے رومانوی اظہار کی تصویر کشی کی، اور ساتھ ہی اسے فلسفیانہ صورت دی اور یہ پنجاب کی روحانی ماحولیات اور باہمی وجود کا عکاس بھی ہے۔

بلھے شاہ کے مزار پر ایک عقیدت مند نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "اب کوئی بھی یہ زبان نہیں بولتا"۔

ایک پنجابی ادیب، شاعر اور ماہرِ لسانیات جمیل احمد پال، کہتے ہیں: "یہ سچ ہے کہ زبانیں ارتقا پذیر ہوتی ہیں، تاہم، یہ ارتقاء نہیں ہے؛ یہ معدومی ہے۔" انہیں تشویش ہے کہ پنجابی کی معدومیت دانستہ غفلت کا نتیجہ ہے۔

کسی زمانے میں پنجاب کی صوفی خانقاہیں ہمدردی اور تخلیقی صلاحیتوں کی درس گاہیں تھیں۔ لوک موسیقی اور لوک داستانیں ثقافتی طاقت کا ذریعہ تھیں۔ آج ان کے آنگن خاموش ہیں، ان کی جگہ سخت گیر مولویوں اور منقطع نوجوانوں

نے لے لی ہے۔

اختلافی آوازیں

زبان کے معاملے پر تجربہ کار کارکن اور معروف پنجابی مصنف اور لکھاری الیاس گھمن سے زیادہ پنجابی ثقافت کے لیے بہت کم لوگوں نے جدوجہد کی ہے۔ وہ کہتے ہیں، "بڑوارہ"، " ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ ایک وقت تھا جب]اس خطے میں[لوگ اپنے دروازے بند نہیں کرتے تھے- وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے۔ اب آدمی کی قدر اس کے کردار کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی دولت کی وجہ سے ہوتی ہے... یہی وجہ ہے کہ نوجوان پنجابی کسان غیر قانونی طور پر نقل مکانی کر رہے ہیں۔" وہ کہتے ہیں "اس کی وجہ مادیت پسند ذہنیت ہے جس نے ایک ہزار سال پرانے سماجی و اقتصادی نظام کو تباہ کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ نظام نے پنجاب کے سماجی تانے بانے کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ "ہم آہنگ دیہات کبھی چھوٹی معیشتوں کے طور پر کام کرتے تھے- ہر کاریگر، کمہار، اور جولاہے کا قابلِ احترام کردار تھا۔ "جب آپ اسے تباہ کرتے ہیں، تو آپ سماج کو تباہ کر دیتے ہیں۔ "انحطاط کے باوجود گھمن پُرامید ہیں۔ "فارسی 800 سال تک سرکاری زبان رہی، یہ پنجابی کو نہیں مٹا سکی، '' وہ کہتے ہیں۔ ''صوفی شاعری ہماری مزاحمت کا استعارہ بن گئی ہے۔'' 1989 میں، انہوں نے پنجابی سائنس بورڈ کی بنیاد رکھی، نصاب تیار کیا، سائنس اور انجینئرنگ کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور زبانی رزمی داستانوں (وار) کو محفوظ کیا - بہادری کی کہانیوں کو کئی نسلوں تک گایا گیا۔ "بچوں کو ہمارے تہواروں کے بارے میں سیکھنا چاہیے نا کہ سن نظریاتی خرافات کو۔ "دریں اثنا، سرکاری غفلت برقرار ہے۔ مقامی لوگوں کے حقوق سے متعلق اقوامِ متحدہ کے اعلامیہ میں لسانی اور ثقافتی حقوق کا ذکر ہے۔ تاہم، پنجابی کو دیوار کے ساتھ لگانے کی روش برقرار ہے۔ بیوروکریسی اور میڈیا پر اردو کا غلبہ ہے؛ پنجابی لوک کہانیوں اور فلموں میں زندہ ہے۔ گھمن کہتے ہیں، "پنجابیوں نے بنگالیوں کی طرح اپنی شناخت کے لیے جنگ نہیں لڑی۔ ہم نے اپنی آواز کے معاملے میں ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ "ٹیکنالوجی اور ادوار کا بھی کردار ہے۔ جمیل پال کہتے ہیں کہ "لوگ اب چرخہ نہیں کاتتے اور نا ہی کسے سے بُنتے (weave with kassa) ہیں، وہ صوفی شاعری کے استعارے کیسے سمجھیں گے؟" الیاس گھمن کا کہنا ہے کہ چیلنجز بہت بڑے ہیں۔ سیاسی بے حسی، اشرافیہ کی عدم دلچسپی اور ثقافتی شرمندگی اس چیز کو ختم کر رہی ہے جس نے پنجاب کو کبھی بنایا تھا۔ جوں جوں شہر پھیل رہے ہیں توں توں روایات سُکڑ رہی ہیں۔ پنجاب ایک دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کی شناخت کو بحال کرنے کی کوئی دانستہ کوشش نہیں ہو رہی۔ پنجابی کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ پنجابی اپنی آواز کا رتبہ بحال کریں۔ مزار تھے جو ایسی کہانیاں بیان کرتے ہیں جنہیں اب کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اب رنگوں کی کہانیاں باقی نہیں بچیں نہ ہی زمین اور درخت اب نوجوانوں کے دِلوں کو بھاتے ہیں۔

(زبانوں کے عالمی دن پر خصوصی اشاعت)

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ دی نیوز آن سنڈے)

انسانی جان اور نقلی ادویات ایک خاموش قتلِ عام

عبداللہ بلوچ

ایک مریض جب دوا خریدتے وقت یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ دوا اسے شفا دے گی یا موت تو سمجھ لیجیے کہ معاشرہ ایک خطرناک موڑ پر کھڑا ہے۔ آج ہم کچھ ایسے حقائق پر بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو محض شکوے نہیں بلکہ پورے خطے کی اجتماعی چیخ ہیں۔ ایسے حقائق جو روز ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے ہیں، مگر رفتہ رفتہ معمول بنا دیے گئے ہیں۔

جب ذمہ دار حلقے انسانی جان کو مقدم رکھ کر معاملات کو بہتر بنانے میں ناکام ہو جائیں، تو عوام اور نظام کے درمیان اعتماد کا رشتہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔ جب عوامی مسائل کو سنجیدگی سے لینے کے بجائے رسمی کارروائیوں تک محدود کر دیا جائے اور انسانی زندگی عملی ترجیح نہ رہے، تو سماجی ڈھانچہ رفتہ رفتہ بکھرنے لگتا ہے۔ ایسے حالات میں اختیار رکھنے والے حلقوں اور عام لوگوں کے درمیان فاصلے نفرت کی تلخیوں سے بھی زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔

یہ صورتِ حال صرف انتظامی کمزوری تک محدود نہیں رہتی بلکہ آہستہ آہستہ اخلاقی اور سماجی انہدام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً لوگ خود کو غیر محفوظ، بے سہارا اور لاوارث محسوس کرنے لگتے ہیں، جبکہ پورا نظام ایک ایسی طاقتور مگر غیر متعلقہ ساخت بن کر رہ جاتا ہے جو موجود تو ہوتی ہے، مگر عوام کے دکھ درد سے کٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

انسانی جان بچانے والی ادویات کا نقلی ہونا دراصل خاموش قتلِ عام ہے۔ یہ جرم صرف منافع خور مافیا تک محدود نہیں، بلکہ ادویات تیار کرنے والے جعل ساز عناصر اور نسخہ لکھنے والے نام نہاد مسیحاؤں کے درمیان ایک غیر اعلانیہ مفاہمت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

جب معیار کی نگرانی کرنے والے ذمہ دار اہلکار بھی انسان دشمن عناصر کا حصہ بن جائیں تو یہ اس پورے نظام پر ایک سنگین سوال بن جاتا ہے۔ ایسا نظام جو جانچ، نگرانی اور احتساب میں ناکام ہو چکا ہو۔ ایسی صورت میں اگر ایک مریض دوا خریدتے وقت زندگی اور موت کے درمیان جھولنے لگے، تو یہ کسی بھی مہذب معاشرے کے لیے شدید شرم کا مقام ہے۔ اسی طرح بچوں کی کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ اور نقلی پن، آنے والی نسلوں کے ساتھ کھلا مذاق ہے۔ بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں، اور جب ان کی صحت، ذہانت اور نشوونما کو زہر آلود کر دیا جائے تو یہ مستقبل کو اندھیرے میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ یہ عمل صرف غیر اخلاقی نہیں بلکہ نسل کشی کی ایک نرم مگر مسلسل شکل ہے۔

کوڑے کرکٹ، گٹروں کی صفائی کا فقدان، اور انہی غلاظتوں کے درمیان ہوٹلوں میں کھانا پکنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں انسانی صحت کی کوئی اجتماعی قدر باقی نہیں رہی۔ بیماریوں کو ہم قدرتی آفات سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں، حالانکہ یہ زیادہ تر ہماری اپنی غفلت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

جہاں نالے اور سڑکیں ہر سال توڑی اور بنائی جاتی ہیں، مگر نکاسیِ آب کا مستقل حل نظر نہیں آتا، وہاں یہ ترقی نہیں بلکہ ترقی کے نام پر لوٹ مار کا ایک تسلسل بن جاتا ہے۔ یہ صرف مالی بدعنوانی نہیں بلکہ عوامی وسائل، وقت اور امیدوں کا قتل ہے۔

لیکن اس پوری صورتِ حال کا سب سے خطرناک پہلو عوام کی بے حسی ہے۔ جب لوگ اپنی آنکھوں کے سامنے تباہی دیکھ کر بھی خاموش رہیں تو ظلم کو سب سے مضبوط سہارا مل جاتا ہے۔ یہ خاموشی چاہے خوف سے جنم لے یا مایوسی سے دونوں صورتوں میں اس کے نتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔

یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں غلط معمول بن جاتا ہے اور صحیح مشکوک۔ ایمانداری کو سادگی، سوال کرنے کو بغاوت، اور حق مانگنے کو گستاخی سمجھا جانے لگتا ہے۔ یہاں سے قومیں اندر سے ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔

تاہم تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مکمل اندھیرا کبھی مستقل نہیں رہتا۔ تبدیلی ہمیشہ شعور کے ایک چھوٹے سے چراغ سے شروع ہوتی ہے کسی ایک فرد، کسی ایک تحریر، کسی ایک سوال یا کسی ایک انکار سے۔

حل فوری نہیں، مگر ممکن ضرور ہے:

عوامی شعور کی بیداری

مقامی سطح پر نگرانی

اجتماعی آواز

اور سب سے بڑھ کر خاموشی کا انکار

اگر عوام یہ طے کر لیں کہ وہ مزید تماشائی نہیں رہیں گے، تو کوئی بھی کرپٹ نظام زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔

گلگت کی بیٹی کی للکار اور لرزتا ہوا نظام

اسرارالدین اسرار

گزشتہ روز گلگت کی فضا میں ایک عجیب سی تپش تھی۔ یہ موسم کی حدّت نہیں تھی، بلکہ ان دلوں کی گرمی تھی جو برسوں کی محرومی، اذیت اور ناانصافی کا بوجھ اٹھائے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ پانی کی مسلسل بندش اور بیس بائیس گھنٹے طویل لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں جب خواتین اور بچے ہاتھوں میں پلے کارڈز اٹھائے کھڑے تھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا شہر اپنے بنیادی حق کے لیے فریاد نہیں بلکہ فیصلہ کن اعلان کر رہا ہو۔

اسی ہجوم میں ایک مقامی خاتون کی آواز گونجی، جو صاف، بے باک اور لرزہ خیز تھی۔ وہ کسی سیاسی جماعت کی نمائندہ نہیں تھیں، نہ ہی کسی تنظیم کی قائد تھیں، وہ ایک عام گھریلو خاتون تھیں، مگر اس دن وہ پورے شہر کی ترجمان بن چکی تھیں۔ ان کے الفاظ تیر کی طرح سیدھے دل میں اترتے تھے، ان کا کہنا تھا گلگت شہر کو حکمرانوں نے نامکمل منصوبوں کا قبرستان بنایا ہے، پانی کوئی سہولت نہیں، زندگی ہے۔ اگر زندگی کے لیے بھی سڑکوں پر آنا پڑے تو یہ نظام پر سوالیہ نشان ہے۔ انہوں نے نظام کے رکھوالوں پر باقاعدہ لعنت بھیجی جس سے اس غیرت مند خاتون کا درد، محرومی، کرب اور گھٹن صاف ظاہر ہوتا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ گلگت کی ہر خاتون ایسے کرب سے گزرتی ہے۔ پانی، بجلی، سڑک اور آٹے کی عدم فراہمی سب سے زیادہ خواتین کو متاثر کرتی ہے کیونکہ یہی خواتین گھروں کا نظام چلاتی ہیں۔ اس سراپا احتجاج خاتون کی گفتگو میں غصہ بھی تھا، درد بھی اور دلیل بھی۔ انہوں نے حکومتی بے حسی کو للکارا، انتظامی نااہلی کو آئینہ دکھایا اور اس سوچ کو رد کیا جو عوامی احتجاج کو وقتی شور سمجھتی ہے۔ ان کے وائرل کلپس نے سوشل میڈیا پر تہلکہ مچا دیا، مگر اصل تہلکہ ان ایوانوں میں برپا ہونا چاہیے تھا جہاں فیصلے ہوتے ہیں۔

آج گلگت کا منظر کسی ترقی پذیر شہر کا نہیں بلکہ ایک ایسی بستی کا ہے جسے ادھورے منصوبوں اور ناقص حکمت عملی نے کھنڈرات میں بدل دیا ہو۔ سیوریج کے نام پر کھودی گئی سڑکیں، ٹوٹی ہوئی گلیاں اور جگہ جگہ بکھری مٹی اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ منصوبہ بندی سے زیادہ ترجیح شاید کمیشن اور مراعات کو دی گئی۔ مسافر ذلیل، مریض پریشان، طلبہ ذہنی اذیت میں اور تاجر کاروباری جمود کا شکار ہیں۔ ہفتوں پانی بند، بجلی غائب، آٹا ناقص اور اشیائے خورد و نوش مضرِ صحت، یہ سب کسی ایک شعبے کی ناکامی نہیں بلکہ پورے انتظامی ڈھانچے کی کمزوری کا نوحہ ہے۔

یہ صورتحال صرف گلگت شہر تک محدود نہیں ہے، پورا گلگت بلتستان انہی مسائل کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ ایک طرف سیلاب اور قدرتی آفات کے متاثرین آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں، دوسری طرف شہری و دیہی علاقوں کے مکین بنیادی سہولیات کے لیے ترس رہے ہیں۔ سیاسی جماعتیں انتخابی بساط بچھانے میں مصروف ہیں، بیوروکریسی پر عیاشی اور بے حسی کے الزامات گردش کر رہے ہیں، اور حکومت یوں غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ متعلقہ محکمے عوامی خدمت کے مراکز کے بجائے چند مخصوص افراد کی آسائش گاہیں بن چکے ہیں۔

جب مردوں پر احتجاج کی پاداش میں ایف آئی آرز درج ہوئیں تو گھروں کی دہلیز سے خواتین اور بچے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ یہ کوئی معمولی منظر نہیں تھا، یہ اس معاشرے کا آخری درجہ اضطراب ہے جہاں خوف کی دیواریں گرنے لگتی ہیں۔ یہ شوقیہ احتجاج نہیں، یہ مجبوری کی انتہا ہے۔ عوام اب سوال نہیں کر رہے، جواب مانگ رہے ہیں۔ وہ یہ باور کرا رہے ہیں کہ ریاست اگر بنیادی ضرورتیں فراہم نہیں کر سکتی تو کم از کم ان کی آواز کو جرم نہ بنائے۔ کچھ حلقے شاید اب بھی یہ سمجھتے ہوں کہ وقتی نعروں اور وقتی بیانات سے معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا، یا فرقہ واریت کا پرانا کارڈ کھیل کر توجہ ہٹا دی جائے گی۔ مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ پانی، بجلی، صحت اور تعلیم ایسے مسائل ہیں جو ہر فرقے، ہر خاندان اور ہر طبقے کو یکساں متاثر کرتے ہیں۔ عوام اب باشعور ہیں، وہ جان چکے ہیں کہ ان کی محرومی کسی مخصوص گروہ کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلسل نااہلی اور بدعنوانی کا نتیجہ ہے۔ یہ احتجاج دراصل ایک تنبیہ ہے۔ یہ اس لاوے کی ابتدائی حرارت ہے جو اگر پھٹ پڑا تو محض بیانات سے قابو نہیں آئے گا۔ حکمرانوں، بیوروکریسی اور سیاستدانوں کو سمجھنا ہوگا کہ عوامی صبر لامحدود نہیں ہوتا۔ اعتماد ایک بار ٹوٹ جائے تو اسے بحال کرنا آسان نہیں رہتا۔

وہ بہادر خاتون دراصل گلگت کی بیٹی ہے، اور اس کی للکار پورے نظام کے لیے پیغام ہے، وہ خاتون گلگت بلتستان کی ہر خاتون اور ہر باسی کی نمائندہ آواز ہے، عوام اب خاموش تماشائی نہیں رہیں گے۔ انہیں نہ سہولت چاہیے، نہ احسان نہیں بلکہ اپنا حق چاہیے۔ اور حق مانگنا جرم نہیں ہوتا۔

وقت کا تقاضا ہے کہ فوری اور سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔ پانی کی فراہمی یقینی بنائی جائے، بجلی کے بحران کا مستقل حل نکالا جائے، ادھورے منصوبے مکمل کیے جائیں اور کرپشن کے دروازے بند کیے جائیں۔ بصورتِ دیگر تاریخ خود کو دہرانے میں دیر نہیں لگاتی، اور جب تاریخ حرکت میں آتی ہے تو تخت بھی ہل جاتے ہیں۔ گلگت کی سڑکوں پر گونجتی وہ آواز محض ایک خاتون کی آواز نہیں تھی، وہ پورے معاشرے کی اجتماعی چیخ تھی۔ اگر اس چیخ کو نہ سنا گیا تو کل یہی صدا طوفان بن سکتی ہے اور طوفان جب اٹھتے ہیں تو صرف دیواریں نہیں، نظام بھی بہا لے جاتے ہیں۔

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے

ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ پتہ:

www.hrcp-web.org

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

کمسنی کی شادی کے خلاف بل، ایک مثبت قدم، قابل ستائش پیش رفت

مدثر احمد طاہر

بھارت میں خواتین کے لیے شادی کی کم از کم عمر 18 سال ہے

چھوٹی عمر کی شادی ہونا ایک انتہائی گھمبیر اور پرانا سماجی مسئلہ تھا جو بالآخر موجودہ حکومت کے دور میں حل ہوا۔ ماضی میں سول سوسائٹی، انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے کم سنی کی جبری شادی کے خلاف نہ صرف مسلسل آوازیں اٹھائی جاتی رہیں بلکہ اس کے خلاف قانون سازی کا مطالبہ بھی کیا جاتا رہا ہے۔ یہ مطالبہ اب پورا ہوا جب پنجاب حکومت کی جانب سے 11 فروری کو پنجاب چائلڈ میرج ریسٹرینٹ آرڈیننس 2026 منظور کیا گیا اور صوبے بھر میں نافذ العمل ہوا۔ بچوں کے تحفظ اور صنفی مساوات کی جانب ایک مفید پیش رفت ہے۔ اس نئے قانون ن کے مطابق اب لڑکیوں کی کم از کم شادی کی عمر 16 سے بڑھا کر 18 سال کر دی گئی ہے۔ حکومت پنجاب نے صوبے کی بچیوں کے حقوق، صحت اور مستقبل کے تحفظ کے لیے ایک طویل عرصے سے واجب الادا مگر جرات مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ دہائیوں سے، کم عمری کی شادی پاکستان کے کئی حصوں میں ایک مستقل چیلنج رہی ہے۔ اگرچہ 1929 کے چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ نے کم از کم عمر کی حدیں مقرر کیں، اس کی سزائیں کمزور تھیں اور نفاذ کے طریقے محدود تھے۔ پنجاب میں، لڑکیوں کی سابقہ قانونی عمر 16 سال تھی، جس سے بچپن اور جوانی کے درمیان واضح فرق پیدا ہو گیا، جس نے بہت سی نوعمر لڑکیوں کو کمزور بنا دیا۔

گذشتہ سالوں کے دوران، کئی المناک واقعات نے قومی توجہ حاصل کی ہے۔ کم عمر لڑکیوں کو زبردستی شادی پر مجبور کرنا، تعلیم سے محروم کرنا، یا گھریلو تشدد کے واقعات نے بار بار کم عمری کی شادی کی انسانی قیمت کو اجاگر کیا ہے۔ کچھ نمایاں کیسز میں، نابالغ لڑکیوں کی شادی تنازعات حل کرنے یا خاندانی دباؤ کے تحت کی گئی، جس سے غربت، سماجی روایات اور قانون کے کمزور نفاذ کے درمیان گہرا تعلق ظاہر ہوا۔ یہ کیسز الگ تھلگ نہیں تھے۔ یہ ایک وسیع تر ساختی مسئلے کی عکاسی کرتے تھے جو قانونی اصلاحات کا تقاضا کرتا تھا۔

سول سوسائٹی تنظیمیں، بچوں کے تحفظ کے علمبردار، اور خواتین کے حقوق کی تنظیمیں شادی کی قانونی عمر کو 18 سال تک بڑھانے کے لیے زور دیتی رہی ہیں۔ مقامی اور بین الاقوامی سطح پر کی گئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ 18 سال سے پہلے شادی شدہ لڑکیاں اسکول چھوڑنے، قبل از وقت اور زیادہ خطرے والے حمل، گھریلو تشدد کا سامنا کرنے، اور اپنی زندگی معاشی طور پر دوسروں پر منحصر رہنے کے امکانات سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس کے نتائج صرف افراد تک محدود نہیں بلکہ کمیونٹیز اور قومی ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ شادی کی کم از کم عمر 18 سال مقرر کر کے، پنجاب نے خود کو بین الاقوامی بچوں کے حقوق کے معیار کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا ہے۔ اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق کے کنونشن کے مطابق 18 سال سے کم عمر کسی بھی شخص کو بچہ قرار دیا گیا ہے۔ عالمی سطح پر، شادی کے لیے کم از کم قانونی عمر 18 سال مقرر کرنے کی طرف مسلسل پیش رفت جاری ہے۔ جنوبی ایشیا اور اس سے آگے کے ممالک نے حالیہ برسوں میں بچوں کی شادی کے خلاف اصلاحات متعارف کروائی ہیں۔ بنگلہ دیش، اگرچہ تاریخی طور پر کمسنی کی شادی کی سب سے زیادہ شرح رکھتا ہے، مگر وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے قانون سازی کے اقدامات کر چکا ہے۔ بھارت میں خواتین کے لیے شادی کی عمر کم از کم 18 سال ہے، اور مزید اصلاحات پر بحث جاری ہے۔ بہت سے افریقی ممالک نے بھی پائیدار ترقی کے اہداف کے لیے اپنی وابستگی کے حصے کے طور پر بچوں کی شادی کے خاتمے کے قوانین کو مضبوط کیا ہے۔

تاہم، دنیا بھر کا تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ صرف قانون سازی ہی بچوں کی شادی کا خاتمہ نہیں کرتی۔ ان ممالک میں جہاں نفاذ کمزور ہے یا سماجی قبولیت زیادہ ہے، سخت قوانین کے باوجود یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اصل چیلنج نفاذ میں ہے۔ پنجاب میں مؤثر نفاذ کے لیے مقامی انتظامیہ، پولیس، نکاح رجسٹرارز، بچوں کے تحفظ کے یونٹس اور عدلیہ کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہوگی۔ شادی کی رجسٹریشن کے نظام کو مضبوط کرنا ضروری ہے۔ پیدائش کی رجسٹریشن کو عام بنانا ضروری ہے تاکہ عمر میں ہیرا پھیری نہ ہو۔ خلاف ورزی کے معاملات میں واضح سزائیں عائد کی جانی چاہئیں تاکہ یہ واضح پیغام دیا جا سکے کہ قانون علامتی نہیں ہے۔۔

یہ آرڈیننس صرف سرکاری نوٹیفیکیشنز اور پالیسی دستاویزات تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ یہ دیہات میں آگاہی سیشنز، مقامی حکام کے لیے تربیتی ورکشاپس، عوامی رویے بدلنے والی میڈیا مہمات، اور کمزور لڑکیوں کے تحفظ کے لیے جوابدہی کے نظام میں تبدیل ہونا چاہیے۔ مذہبی علماء اور کمیونٹی رہنماؤں کو بھی تعمیری طور پر شامل ہونا چاہیے تاکہ نابالغوں کے تحفظ کے حوالے سے اتفاق رائے پیدا کیا جا سکے۔ کم از کم عمر کو 18 سال تک بڑھانا ایک سادہ مگر طاقتور اصول کی تصدیق کرتا ہے: بچپنے کی حفاظت ضروری ہے۔ لڑکیاں مناسب وقت ملنے کی مستحق ہیں تاکہ وہ بڑھیں، پڑھائی کریں، مہارتیں حاصل کریں، اور اپنے مستقبل کے بارے میں باخبر فیصلے کریں۔ شادی ایک فیصلہ ہونا چاہیے جو بالغ ہونے پر کیا جائے، نہ کہ دباؤ یا حالات کا نتیجہ ہو۔ پنجاب نے 18 سال کی عمر کی لائن کھینچ لی ہے۔ یہ فیصلہ پیش رفت کی عکاسی کرتا ہے، لیکن کامیابی کا اصل پتہ آنے والے سالوں میں لگے گا۔ اگر اسکولوں سے نکلنے والی لڑکیوں کی تعداد کم ہو، اگر نوعمر حمل کم ہوں، اگر نوجوان خواتین اعتماد اور مواقع کے ساتھ بالغ ہوں، تو یہ اصلاح اپنا مقصد حاصل کر لے گی۔ اب قانون نافذ ہو چکا ہے۔ یہ ذمہ داری ہم سب کی ہے کہ ہم پنجاب کی ہر لڑکی کو شادی سے پہلے بچپن کا مکمل تجربہ حاصل کرنے کا موقع دیں۔

جہنم کے مکین

عزیز علی داد

ہمیں بچپن سے ہی کلیات کے کُلّیے سکھائے جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں قبیلے اور علاقے کا کُلّ اہم ہوتا تھا

گلگت بلتستان میں پچھلے دنوں کچھ افراد کی جانب سے سوشل میڈیا پر گستاخانہ مواد شیئر ہونے پر مظاہروں اور احتجاج کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ گلگت بلتستان میں سوشل میڈیا میں توہین اور تحقیر آمیز مواد شیئر کرنے کے رجحان میں پچھلے کچھ مہینوں میں بہت زیادہ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس معاملے پر سوشل میڈیا اور اس کے استعمال کے متعلق ایک نئی بحث چھڑی ہے۔ مگر اس بحث میں معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے ایک سادہ سے فارمولے کہ ایک دوسرے کے عقیدوں کا احترام کیا جائے کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ معاملہ تب تک حل نہیں ہوگا جب تک ہم ریاست، تعلیم، سماج، گھر اور مروج مذہبی سوچ کے متعلق کچھ بنیادی سوالات نہ اٹھائیں۔ اس مضمون میں ہم گلگت بلتستان میں مذہبی سوچ کے متعلق کچھ زاویے اور ان کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کرینگے۔

کسی بھی معاشرے میں احترام اچانک سے پیدا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی پیدائش کے لئے معاشرے کے ذہن اور روح کی آبیاری کی جاتی ہے۔ ذہن اور فکر کی یہ آبیاری ہی ایک ایسی مثبت سوچ کی بنیاد رکھتی ہے۔ اور اسی بنیاد کے اوپر ایک اچھی انسانی شخصیت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر معاشرے میں فرد کی عمارت کی بنیاد ہی تخریب پر رکھی جائے تو انسان کو حیوان بننے سے کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔ صائب تبریزی کا کہنا ہے:

"خشت اول چوں نہد معمار کج،
تا ثریا می رود دیوار کج"

ترجمہ: اگر معمار پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھے تو دیوار آسمان تک بھی ٹیڑھی ہی جائے گی۔

ٹیڑھی بنیاد پر بنائی گئی شخصیت آسمان اور روحانی بلندیوں تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتی ہے کیونکہ تخریبی جسم اور ذہن پر روح کے پر نہیں اگتے۔ یہی بات معاشرے پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ معاشرہ جو اپنی نئی نسل کی تربیت نفرت، خوف اور تحقیر کے ذریعے کرتا ہے، وہ اپنے سماجی وجود کے اندر زہر بھر رہا ہوتا ہے۔ یہ زہر باہر کے بیگانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بلکہ یہ زہر سماجی جسم کو اندر سے ہی کھا جاتا ہے۔ یہی صورتحال آج گلگت کے سماج کے ساتھ ہے۔ بدقسمتی سے گلگت کے معاشرے کے بطن میں اتنا زہر بھر گیا ہے کہ وہ اس میں موجود اپنے ہی بچوں کو مار رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم اس زہر کو تریاق سمجھ کر اپنے بچوں کو کھلا رہے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں احترام کا ظہور فرد کی سماجی تربیت، طریق عمل اور ذہن سازی کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ مگر گلگت بلتستان کے سماج میں ریاست سے لیکر تعلیم، نصاب، مسجد، گھر اور گھر کا سربراہ سب ہی فرد کی تعمیر کی بجائے تخریب کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ تخریب پہلے خیالات کی سطح پر وقوع

ریاست اور تعلیم سے نکل کر ہم گلگت بلتستان کے گھر کی طرف آتے ہیں۔ ہمیں بچپن سے ہی کلیات کے کُلّیے سکھائے جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں قبیلے اور علاقے کا کُلّ اہم ہوتا تھا۔ اب فرقہ کے کُلّ نے افراد پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ اس لئے ہم باہر سماج میں موجود مختلف فکر کے حامل لوگوں اور گوناگوں دنیا کی تفہیم اسی فرقہ وارانہ کُلّ کے کلئے کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تعلیم یافتہ ہو کر بھی اپنا ذہن اور اپنی روح فرقے کے ہاتھوں گروی رکھتا ہوں۔ یوں تعلیم میرے بیمار ذہن کے اندر داخل خود بھی بیمار ہو جاتی ہے۔

پذیر ہوتی ہے۔ جب زہریلے خیالات ذہن پر قبضہ جما لیتے ہیں تو فرد ایک ایسا کھلونا بن جاتا ہے جو اپنی سوچ کی اجارداری کے لئے اپنے سے مختلف سوچنے اور عمل کرنے والے انسان کا قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جب ایسے فرد کو اپنے سے مختلف سوچ کے حامل انسان سے واسطہ پڑتا ہے، تو وہ اسے اپنے وجود کے لئے خطرہ سمجھتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے وجود کو بچانے کے لئے دوسرے کے وجود کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ گلگت بلتستان میں اس رویے کی تشکیل میں ریاست سے لیکر سماج اور گھر کے ادارے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

ریاست نے سکول سے لیکر یونیورسٹی تک ہمارے ذہنوں کے اندر اسلام کو اتنا ٹھونسا ہے کہ اب اس میں نئے خیالات اور نیا مذہبی علم داخل نہیں ہو سکتے۔ میں خود جماعت نہم میں داخل ہوا تو سنی اور شیعہ اسلامیات کو انتخاب کرنے کے مسئلے سے دوچار ہوا۔ اسماعیلیوں اور نوربخشیوں کے لئے کوئی اسلامیات تھا ہی نہیں۔ سو ان میں سے ایک کو پڑھنا پڑا۔ کراچی میں انٹر کی تعلیم کے دوران ایک سندھی ہندو لڑکا دوست بنا۔ نہایت شریف اور ایماندار تھا۔ میں نے پوچھا کہ اسلامیات پڑھتے ہوئے کیسے لگتا ہے؟ کہنے لگا کہ یہاں غیر مسلموں کو اسلامیات کی جگہ اخلاقیات کا مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ یہ میرے لئے نئی بات تھی۔ عجیب سا ملک ہے۔ جن کو اخلاق سکھانا ہے ان کو وہ مضمون پڑھایا نہیں جاتا اور جن کو ضرورت نہیں انھیں پڑھایا جا رہا ہے۔ جاپان میں سکول کے ابتدائی پانچ سالوں میں صرف معاشرتی اخلاقیات سکھایا جاتا ہے۔ جب انسان کی شخصیت اخلاقیات کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو اس میں جو بھی فکر بشمول مذہب داخل ہو تو اس کے خدوخال اس فرد کی شخصیت کی طرح ہی بن جاتے ہیں کیونکہ مذہب ہمارے ذریعے ہی ظاہر ہوتا ہے نا کہ انسان کی غیر موجودگی میں جنگل اور بیابانوں میں۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی مذہب کا خدا اور دیوتا ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ اس سماج کا ذہن ہے۔ کہتے ہیں کہ علم بشریات کے ماہرین جب مرکزی افریقہ کے قبائل اور ان کے مذاہب کا مطالعہ کرنے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ قبائلی خداوں کے مجسموں میں بنی ناک بھی افریقیوں کے طرح بڑی اور پھیلی ہوئی تھی۔ اسی طرح افریقہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ مذہبی پینٹنگز میں سیاہ رنگ کا دکھایا جاتا ہے۔ یہی حال گلگت بلتستان میں اسلام کا ہے۔ ہمارا مذہب بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارا سماجی ذہن ہے۔ چلاس میں مذہب کا اظہار استور سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح جاگیر بیسن کا مذہبی اظہار کشروٹ سے الگ ہے۔ بلتستان میں مذہب کا اظہار نگر سے مختلف ہے۔ ظفر وقار تاج نے اسی لئے کہا ہے:

دبون تھئی دنیا گنی نس سنیکین دنیا الگ،
تھ ءتھتی قصہ یولک ہن نئی نے قصہ الگ،
ٹوم تو میں جمات الگ ہن ٹوم ٹوم مولا الگ،
امبھری خدا الگ ہن کے پھری خدا الگ۔

ترجمہ: مالک تیری بنائی ہوئی دنیا کا تیرے چاہنے والوں نے حلیہ بگاڑ دیا ہے،
تیرا فرمایا ہوا کچھ اور ہے اور ان کچھ کہانی کچھ اور،
سب کی اپنی اپنی الگ مساجد ہیں اور اپنے اپنے علیحدہ امام ہیں،

پچھلی بستی کا خدا الگ ہے، تو اگلی بستی کا مختلف۔

ریاست اور تعلیم سے نکل کر ہم گلگت بلتستان کے گھر کی طرف آتے ہیں۔ ہمیں بچپن سے ہی کلیات کے کُلّیے سکھائے جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں قبیلے اور علاقے کا کُلّ اہم ہوتا تھا۔ اب فرقہ کے کُلّ نے افراد پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ اس لئے ہم باہر سماج میں موجود مختلف فکر کے حامل لوگوں اور گوناگوں دنیا کی تفہیم اسی فرقہ وارانہ کُلّ کے کلئے کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تعلیم یافتہ ہوکر بھی اپنا ذہن اور اپنی روح فرقے کے ہاتھوں گروی رکھتا ہوں۔ یوں تعلیم میرے بیمار ذہن کے اندر داخل خود بھی بیمار ہوجاتی ہے۔ تعلیم ذہن کی کشادگی اور سفر وسیلہ ظفر کا سبب ہوئے ہیں۔ مگر گلگت بلتستان میں اس کے برعکس عمل ہوتا ہے۔ ہم علاقے کو چھوڑ کر پاکستان کے دیگر شہروں یا باہر کی دنیا میں جاتے ہیں تو زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق کچھ نیا علم حاصل کرتے اور ہنر سیکھتے ہیں۔ یہ گلگت بلتستان کے ہر گھر کے فرد کی کہانی ہے۔ جب میں گلگت سے باہر نکلا تو گورڈن کالج راولپنڈی میں عیسائی استاد پروفیسر نعیم تھینیل سے انگریزی ادب پڑھا۔ لندن میں شیعہ ڈاکٹر فرہاد دفتری نے اسماعیلی تاریخ پڑھائی تو سنی محمد آرکون نے مسلم فلسفہ اور فکر پڑھایا، فلسطینی ڈاکٹر سوہا نے اسلام کا فکر جدید پڑھایا۔ ایلیس ہنس برگر نے کلاسیکی ادب اور فلسفہ پڑھایا، لندن کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹیڈیز کے پروفیسر جی آر ہاٹنگ نے اسلامی تاریخ پڑھائی۔ یہ وہی پروفیسر ہاٹنگ ہیں جو دنیا کے اسلام کے متعلق سب سے بڑے انسائیکلوپیڈیا The Encyclopaedia of Islam کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ اس طرح ایڈنبرا یونیورسٹی کیرابرٹ ہیلن برانڈ نے اسلامک آرٹ پڑھایا۔ باقی کا فرانہ علم فلسفہ کے مضمون کے استادوں کا ذکر رہنے دیں۔ ان لوگوں نے میری مذہبی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ادب اور اسلام کے متعلق میری فکر و نظر کو نہ صرف وسعت بخشی، بلکہ دنیا کو دیکھنے کا نیا انداز دیا۔ یہ میرے روحانی اور ذہنی اساتذہ ہیں۔ یہ تجربہ مجھی تک محدود نہیں بلکہ کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پاکستان کے دیگر شہروں میں موجود گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے سب طلبا کا ہے۔ اسی طرح پچاس اور ساٹھ کی دھائی میں کراچی میں رہنے والے گلگت بلتستانیوں نے درزی، کاروبار , بیکری خانسامے، مشین ٹھیک کرنے، گاڑی چلانے، اور دیگر اقسام کے ہنر سیکھے اور وطن واپس آکر نئے پیشے متعارف کروا کر خوشحالی کی نئی راہیں کھولیں۔

واحد چیز جس کے متعلق ہم گلگت بلتستان کے لوگ باہر جا کر کچھ بھی نہیں سیکھتے ہیں وہ مذہبی فکر ہے۔ اگر سیکھتے بھی ہیں تو پہلے ہی سے سماج اور گھر سے وصول شدہ مذہبی تعصب کو مضبوط بنانے کے لئے۔ اسی لئے جب ہم پڑھائی یا کام کے لئے پاکستان کے بڑے شہروں میں جاتے ہیں تو وہاں سے ایسی ہی چیز ڈھونڈتے ہیں جو ہمارے فرقہ وارانہ ذہن کو تقویت بخشے۔ اب تو ہمیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں ہم پی ایچ ڈی سپروائزر بھی اپنے فرقے کا تلاش کرتے ہیں۔ ہم کراچی سے اردو تہذیب و ادب کی چاشنی، لاہور کا کھلا دل اور پشاور کی مہمان نوازی گلگت نہیں لاتے۔ وہاں سے ہم سپاہ صحابہ، سپاہ محمد اور طالبانی سوچ گلگت لاتے ہیں۔ ہمارے اسلام کی مضبوطی کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ حضرت محمد ﷺ کی حفاظت سپاہ محمد اور صحابہ کے تحفظ کا ٹھیکہ سپاہ صحابہ نے لے رکھا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ گلگت بلتستان کی کسی مزہبی تنظیم نے ڈاکٹر مہدی حسن مرحوم، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر حسین محمد جعفری، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر عائشہ جلال، ڈاکٹر ناظر محمود وغیرہ کو اپنے افکار شیئر کرنے کے لئے علاقے میں مدعو کیا ہو۔ ان کی جگہ پچھلی تین دھائیوں سے مسلح جتھوں کے عہدیداروں اور تکفیری فیکٹری کے سربراہان کو مدعو کیا جاتا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مذہبی علم کے میدان میں بھی ہم کوئی نئی فکر متعارف نہیں کرواتے اور نہ ہی مذہب کے متعلق کام کرنے والے عالمی اسکالرز کو بلاتے ہیں۔ بلاتے بھی ہیں تو انہی لوگوں کو جن کا کام ایک دوسرے کو مسترد کرنا ہے۔ گلگت بلتستان کے چاہے سنی ہو , شیعہ یا اسماعیلی، انھوں نے کبھی عبدل کریم شروش، پروفیسر محمد آرکون، ڈاکٹر فضل الرحمان، طارق رمضان، ڈاکٹر حمید اللہ، سید حسن نصر، ڈاکٹر فرہاد دفتری، مجید فخری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر عزیز اسماعیل، ڈاکٹر علی اسانی، طلال اسد، نصر ابوزید، آمنہ ودود، فاطمہ مرنیسی، ڈاکٹر شوہا تاجی فاروقی وغیرہ کو متعارف کروایا ہے؟ جواب منفی میں ہے۔ اس فکری لاعلمی یا پرہیز کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ وجہ یہ ہے کی ایسے مفکروں اور عالموں کا علم اور خیالات جہالت کو سخت نقصان پہچاتے ہیں۔ جہالت میں بڑی برکت ہے۔ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو اس جہالت کی دکان کو خود اپنے ہاتھوں سے ختم کرے۔

جب ہم نے اپنے ذہن، سماج اور گھر کے دریچوں اور دروازوں کو علم کی روشنی کے ڈر سے بند رکھا ہے تو لامحالہ طور پر ہم پہ جہالت ہی راج کریگی۔ اب اسی جہالت کے پیدا کردہ بلائیں ہمارے گھروں، گلیوں اور چوراہوں سے نکل کر سوشل میڈیا پہ وارد ہورہے ہیں۔ گلگت شہر میں حالیہ دنوں میں سوشل میڈیا پر گستاخانہ مواد کی وجہ سے رونما ہونے والے واقعات پر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ سوشل میڈیا کی وجہ سے ہورہا ہے۔ یہ بالکل غلط توجیہ ہے۔ سوشل میڈیا گھر اور گلی میں موجود اس ذہن کو سامنے لارہا ہے جو خون کا پیاسا اور دوسروں سے نفرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا پہ ہمارا جو امیج ہے وہ اس سے کم ہے جو ہم حقیقت میں ہیں۔ اگر ہمارا پورا چہرہ سامنے آگیا تو ہم دنیا میں کہیں بھی اپنا چہرہ دکھانے قابل نہیں رہی گے۔ سوشل میڈیا ایک آئینہ ہے جو ہمارے عکس کو منعکس کررہا ہے۔

اگر ہم نے اپنے بچوں کو فرقہ واریت کی بلا سے بچانا ہے تو ہمیں اپنے گھروں میں ایسے بیان اور بیانیوں کو داخل ہونے نہیں دینا جو مجھے مجھ سے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو مرتد اور ان کے ہاتھ کے ذبح کو حرام قرار دیتا ہے۔ گلگت میں تو گائے اور بکرے کے بھی فرقے بنے ہوئے ہیں۔ ایسا بیانیہ جو میرے گھر سے میرے اپنے بھائی کو ہی خارج کرے، وہ جھوٹا بیانیہ ہے۔ سکول اور گھر میں سماجی اخلاق کی تربیت نہ ہو تو ایسا بے تربیت اور اخلاق سے عاری مگر نظریاتی طور پر کٹر ذہنیت کے حامل فرد کا سب سے پہلا شکار اس کے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی جہالت میں نعوذ باللہ خدا سے بھی اس کے اختیارات چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لئے ہیں۔ اگر کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، تو اس کو سزا قیامت میں ملے گی۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کو سزا دینے والے؟ مگر ہمیں قیامت پر یقین نہیں ہے، اسی لئے ہم نے دوسروں کی زندگی میں یہاں ہی قیامت برپا کرنے کا ٹھیکہ اپنے ہاتھوں میں لیا ہوا ہے۔

بدقسمتی سے اب تک ہم اسلام کے متعلق تحقیق اور فکر میں اپنا کچھ حصہ نہیں ڈال سکے کیونکہ ہمیں فرقے کے نام پر عقل اور فکر سے محروم کیا گیا ہے۔ اور جس سماج میں ذہن میں فکر کی بجائے تعصب، دل میں نفرت اور ہاتھ میں بندوق ہوتی ہے، یہ بہت ہی مہلک ملاپ ہوتا ہے۔ اس ہلاکت خیز ملاپ کی جھلکیاں میں پچھلے کچھ مہینوں سے گلگت شہر کی سڑکوں اور چوراہوں پہ دیکھ رہا ہوں۔ تب سے مجھے گلگت جنت کا ٹکڑا کم اور جہنم کا حصہ زیادہ نظر آنے لگا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے یہ جہنم خود اپنے ہاتھوں سے ہی جنت کے حصول کے چکر میں بنائی ہے۔ اب ہماری ان حرکات کی وجہ سے جنت تو ہمیں ملنے سے رہی۔ اب گلگت کا جہنم ہی ہمارا امکان ہے اور ہم اس کے مکین۔ اس جہنم کی نگرانی ارضی فرشتے کررہے ہیں۔ اب ہمارا مقدر اسی جہنم میں رہتے ہوئے اسے جنت بنانا ہے۔

جلتی ہوئی زندگی

میمونہ سحر

شہری آگ زندگی اور معاش کے لیے بہت تباہ کن صورتحال پیدا کرتی ہے۔ یہ سیکنڈوں میں بڑے پیمانے پر املاک اورلوگوں کوجلادیتی ہے۔اسے شہروں کی جدید تباہی بھی کہا جا سکتا ہے۔ تجارتی پلازوں، رہائشی عمارتوں، شاپنگ مالز،مخلوط استعمال کی عمارتوں میں آگ زندگی اور معاش کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ایک چنگاری بڑے معاشی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ آگ موجودہ نظام کی کمزوری اور محل وقوع کے مطابق ڈھانچے کی ایک زنجیر بن سکتی ہے۔ ہر ڈھانچے میں کوئی نہ کوئی نظام ضرور ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے اس نظام میں رہنے والے قوانین کونظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہولناک واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اس نظام میں ضوابط، ہنگامی ردعمل، عمارت کا انتظام اور نفاذ وغیرہ شامل ہیں۔ فائرسیفٹی کوڈز کے کمزور نفاذ، فائرسیفٹی سرٹیفکیٹ کی عدم موجودگی، باقاعدہ آڈٹ اور معائنہ کی عدم موجودگی، یوٹیلیٹی سروسز اور میونسپل حکام کی خراب حالت کی وجہ سے سسٹم ناکام ہوسکتا ہے۔ پانی کی قلت، ٹریفک کی بھیڑ اور ناکافی آلات جیسی خدمات کی فراہمی میں تاخیر ہونے پر یہ سب سے زیادہ تباہ کن صورتحال پیدا ہوتی ہے۔

بہت سے معاملات میں قوانین کاغذ پر موجود ہیں، لیکن عمل درآمد غیر موثر ہے۔ غیر مجاز ترامیم، غیر قانونی توسیع اور بلاک شدہ خارجی راستوں پر اکثر اس وقت تک کسی کا دھیان نہیں جاتا جب تک کہ سانحہ نہ ہو جائے۔ فائر الارم، اسپرینکلر سسٹم اور اسموک ڈیٹیکٹر کی عدم موجودگی پیشگی انتباہی صورت حال کو چھپا دیتی ہے۔ ہنگامی صورت حال میں سیڑھیاں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں، ان کی دستیابی اور ہنگامی راستے کی موجودگی ضروری ہے۔ایسی بلند و بالا عمارتوں کے لیے آگ کے خلاف مزاحم ہونے والا تعمیراتی مواد استعمال کرنا چاہیے؛ آگ کے خلاف مزاحمت کے دروازے نصب کرنا چاہئیں .اوورلوڈ بجلی کی تاروں اور پرانے انفراسٹرکچر کو مناسب طریقے سے تبدیل کرنا چاہیے۔

ایک بڑا مسئلہ شہری منصوبہ بندی کا ہونا ہے۔ گنجان آباد علاقوں میں پلازہ یا تجارتی عمارت کی تعمیر جس میں ایمرجنسی ایگزٹ یا ایمرجنسی گاڑیوں تک محدود رسائی ہو۔ تنگ سڑکیں، غیر رسمی اسٹالز اور پارکنگ کے ساتھ اونچی بلند و بالا عمارتیں، داخلی راستوں کی بندش سمیت دیگر عوامل شہری علاقوں کی آفات کے بڑے اسباب ہیں۔

آگ لگنے کے واقعات کی وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں لیکن بجلی کے شارٹ سرکٹس، اوورلوڈڈ تاروں، گیس کے رساؤ، کھانا پکانے کے غیر محفوظ انتظامات، آتش گیر مواد کا غلط ذخیرہ، ناقص پاور سپلائی، ناقص یو پی ایس سسٹم، ماچس، موم بتیاں یا سگریٹ وغیرہ کا سب سے خطرناک اور لاپرواہی سے استعمال زیادہ عام وجوہات ہیں۔

روک تھام کے اقدامات لاگو کرنے سے آگ کی آفات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ فائرسیفٹی کے ضوابط کو سختی سے نافذ کرنا چاہیے۔تعمیل اور معائنہ، فائرسیفٹی آڈٹ کے ڈیجیٹل ریکارڈز ہونے چاہئیں۔ ضوابط کی خلاف ورزی پر بھاری جرمانے لاگو کیے جانے چاہییں اور ہنگامی صورت حال کے لیے انخلاء کے کچھ منصوبے متعارف کرنے چاہئیں۔

ایسی عمارتوں اور فیکٹریوں کے مالکان اور انتظامیہ پر بھاری جرمانے لاگو کرنے چاہئیں جو ضواط کی تعمیل نہیں کرتے۔ انہیں اسموک ڈیٹیکٹر، ایمرجنسی الارم، ہائیڈرنٹس اور اسپرینکلرز کی تنصیب کا پابند بنانا چاہیے۔ اسی طرح، تمباکو نوشی کے علاقوں میں مکمل حفاظتی اقدامات متعارف کرائے جائیں، ہنگامی راستہ واضح طور پر نشان زد ہونا چاہیے۔ آگ سے بچانے والے دروازے اور کمپارٹمنلائزڈ فرش انسٹال کرنا چاہیے۔ اسی طرح، محفوظ اسٹوریج مواد استعمال کرنا چاہئے۔ عمارتوں اور پلازوں کی حفاظت کے لیے تربیت یافتہ فائروارڈنز تعینات کیے جائیں۔

خارجی راستوں اور اسمبلی پوائنٹس کے بارے میں آگاہی کے بارے میں مکینوں کو تربیت دی جائے۔ انہیں بجلی کے غیر محفوظ کنکشن سے بچنے کے لیے آگاہی دینی چاہیے۔ اگر انہیں کوئی بدنظمی نظر آئے تو انہیں عمارت کی حفاظت کے لیے مقررہ حکام کو مطلع کرنا چاہیے۔

اگرچہ خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے، اسے کبھی نہیں روکا جا سکتا لیکن تخفیف کی حکمت عملیوں کو استعمال کر کے اسے کم کیا جا سکتا ہے۔ خودکار چھڑکنے والا نظام شعلوں کو جلد دبا سکتا ہے۔ دھواں نکالنا اور وینٹیلیشن تنبیہ کے لیے مفید ہے۔ اونچی رہائشی اور تجارتی عمارتوں کی تعمیر کے لیے فائر ریٹیڈ دیواریں اور دروازے استعمال کیے جائیں۔ آگ بجھانے کا سامان تربیت یافتہ ٹیموں کے ساتھ ہر عمارت میں ترتیب دیا جائے تاکہ کسی بھی واقعے سے بچا جا سکے۔ اس دور میں زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی وقت کی نگرانی کا نظام بہت کامیابی کے ساتھ رائج ہے، اسے تمام بلند و بالا عمارتوں اور تجارتی علاقوں کے منتخب زون میں بھی متعارف کرایا جانا چاہیے۔

اونچی عمارتوں کے ڈھانچے کی منظوری کے لیے انخلاء کے منصوبے اہم شرائط ہونی چاہئیں۔ انخلاء کے منصوبے واضح طور پر تیار کیے جائیں اور عمارت کی ہر منزل پر آویزاں کیے جائیں۔ عمارت کے مکینوں کو ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے تربیت دی جائے۔ دکانداروں اور کمرشل پلازہ کے پورے عملے کو ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تربیت دی جائے۔

بدقسمتی سے آگ کی تباہی نہ قدرتی آفت ہے اور نہ ہی انسانی آفت، یہ منصوبہ بندی، حکمرانی اور احتساب کی ناکامی ہے۔ قانون کا نفاذ، عمارتوں کے محفوظ ڈیزائن، سمارٹ سٹی کی منصوبہ بندی اور شہریوں میں آگاہی اور تعلیم لازمی ہونی چاہیے۔ زندگی کی کوئی قیمت نہیں، کسی چیز کی غفلت نقصان کی وجہ نہیں ہے۔ اظہار افسوس صحت اور زندگی کے نقصان کا مداوہ نہیں کرسکتا۔ عمارت دوبارہ تعمیر ہوسکتی ہے لیکن زندگی اور جسم کا نقصان پورا نہیں ہوسکتا۔ محفوظ مستقبل ہر کسی کا حق ہے، فائر سیفٹی کوئی آپشن نہیں ہے، یہ انسان کا بنیادی حق ہے۔

گزشتہ ماہ کراچی کے قلب میں ہمیں ایک تباہ کن واقعہ کا سامنا کرنا پڑا۔ گل پلازہ کے جانی و مالی نقصان کا سرکاری طور پر اعلان نہیں ہوا۔ مقامی نیوز چینلز اور اخبارات کے مطابق دسیوں جانوں کا اور کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ اس طرح کے واقعات کا سب سے بڑا سبب بہتر نظم و ضبط، منصوبہ بندی، ڈھانچے، ڈیزائن، ابتدائی طبی سہولیات، پالیسیوں کی کمی ہے۔ مقامی لوگوں اور عمارتوں کے مکینوں کو ہنگامی حالات سے نمٹنے کی تربیت نہیں دی گئی تھی۔ آگاہی، تخفیف، انخلاء کے منصوبے، حفاظتی پروٹوکول غائب تھے، فائر بریگیڈ کی مناسب خدمات ناکافی تھیں۔ بدقسمتی سے ایمرجنسی ایگزٹ نہ مل سکا جس کی وجہ سے جانی نقصان ہوا۔

روشنیوں کے شہر میں یہ پہلا واقعہ نہیں تھا لیکن اگر ہم پالیسی، ڈیزائن، منصوبہ بندی، تخفیف کے منصوبے، انخلاء کے منصوبے، تربیت، حفاظتی اقدامات، ہنگامی اخراج، ہنگامی راستے کے منصوبے، ابتدائی طبی سہولیات، فائرسیفٹی کے آلات کے منصوبے اور تربیت یافتہ ٹیمیں متعارف کرائیں تو یہ آخری واقعہ ہو سکتا ہے۔ ریئل ٹائم مپنگ اور فوری ردعمل کی تربیت کے لیے جی آئی ایس ایپلیکیشن کا استعمال بہت کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔۔ لوگ ضرورت کے وقت فوری طور پر مختصر ترین راستہ منتخب کر سکتے ہیں۔ انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ مقامی لوگوں کو حفاظتی پروٹوکول کی تربیت دیں تاکہ اس قسم کے حادثات سے بچا جا سکے۔

پاکستان میں خواجہ سراؤں کے لیے من کی بات کرنے کی محفوظ جگہوں کا قیام

مرکزی دروازے سے اندر آنے کے بعد ایک تنگ سیڑھی چڑھ کر دفتر نما کمرہ آتا ہے

پرانے لاہور کے ایک گنجان آباد علاقے میں عام نظروں سے اوجھل ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں معاشرے کے نظر انداز کیے گئے لوگوں کو پناہ ملتی ہے۔ اس جگہ کی نشاندہی کے لیے نام کی کوئی تختی وغیرہ موجود نہیں۔ لوہے کے ایک سیاہ رنگ دروازے پر دستک دی جائے تو اندر سے آنے والی آواز شناخت پوچھتی ہے جسے بتانے کے بعد داخلے کی اجازت مل جاتی ہے۔

مرکزی دروازے سے اندر آنے کے بعد ایک تنگ سیڑھی چڑھ کر دفتر نما کمرہ آتا ہے۔ یہاں دیواروں پر 'ایچ آئی وی' کی تشخیص اور آگاہی سے متعلق پمفلٹ چسپاں دکھائی دیتے ہیں جن میں بعض پر مدد لینے کے لیے فون نمبر بھی درج ہیں۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ پلاسٹک کی چند کرسیاں رکھی ہیں۔ یہ کوئی کلینک نہیں بلکہ 'دوستانہ' نامی تنظیم کا مرکز ہے جو 'ایچ آئی وی' کے مریضوں کو پناہ دیتی ہے۔ یہاں لوگ بیماری کی تشخیص اور اس سے بچاؤ کی سہولت لینے کے علاوہ قبولیت اور سکون محسوس کرنے بھی آتے ہیں۔

یہاں اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (یو این ڈی پی) کی جانب سے پاکستان میں 'ایچ آئی وی' اور انسانی حقوق سے متعلق قوانین کے جائزے کے لیے ایک مباحثہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ ملک بھر میں اسی نوعیت کے ماحول میں ایسے 17 مباحثے منعقد کیے گئے جو ان زندگیوں کی ایک نادر جھلک پیش کرتے ہیں جو عموماً سماج کی جانب سے نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔

اس مباحثے کا مقصد یہ جاننا ہے کہ آیا پاکستان میں 'ایچ آئی وی' سے نمٹنے کے لیے موجودہ اقدامات اور قوانین مریضوں اور متاثرہ گروہوں کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں یا نہیں اور کیا یہ نظام 'ایچ آئی وی' کے پھیلاؤ کو محدود کرنے میں موثر ثابت ہو رہے ہیں۔

بدنامی اور تفریق

اس جائزے میں 17 مباحثے شامل تھے جن میں 119 افراد نے حصہ لیا۔ اس کے ساتھ اہم معلومات فراہم کرنے والے 119 افراد کے انٹرویو، مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے پانچ فریقین کے ساتھ مشاورت، 50 ادارہ جاتی سوالنامے، 233 آن لائن سروے اور 112 قومی و صوبائی قوانین، پالیسیوں اور بین الاقوامی وعدوں کا تفصیلی جائزہ بھی لیا گیا۔ ان سے حاصل ہونے والی معلومات اہم اعداد و شمار

کے ساتھ لوگوں کی حقیقی زندگیوں اور تجربات کی عکاسی بھی کرتی تھیں۔

گفتگو کے آغاز پر بات کرنے والے ایک شخص نے اطمینان سے بتایا کہ 'ایچ آئی وی' سے بچاؤ اور علاج کے لیے کوششیں تو کی جا رہی ہیں لیکن اس مرض کے سماجی اور قانونی پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ بدنامی اور امتیاز کو روکنے کے لیے اقدامات اب بھی ناکافی ہیں۔ کمرے میں موجود سب لوگوں نے سر ہلا کر اس بات کی تائید کی۔

ایک اور شخص نے بتایا کہ لوگ ان پاس آتے ہیں اور ان کی داستانیں تحقیق اور مطالعہ کے لیے سنتے ہیں لیکن خود ان مریضوں کے لیے کچھ بھی نہیں بدلتا۔

پولیس کا ناروا سلوک

مباحثے کے شرکا کی کہانیاں ایک جیسی معلوم ہوتی تھیں اور اندازہ ہوا کہ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک جیسے ہی تجربات ہیں۔ متاثرہ گروہوں میں شامل ٹرانس جینڈر افراد روزمرہ زندگی بھی معمول کے مطابق نہیں گزار پاتے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے انہیں روکا جانا عموماً پوچھ گچھ میں بدل جاتا ہے اور قومی شناختی کارڈ ان کے خلاف گویا ہتھیار بن گیا ہے۔

آپ کے شناختی کارڈ پر مرد کیوں لکھا ہے؟ کیا یہ واقعی آپ ہیں؟ مزید اہلکار بلائے جاتے ہیں کہ وہ دیکھیں، پرکھیں اور فیصلہ کریں۔

چھوٹے شہروں میں اس حوالے سے خوف اور بھی زیادہ ہے۔ مباحثے میں بتایا گیا کہ رمضان کے مہینے میں ایک ٹرانس خاتون پر اس جرم کا الزام عائد کیا گیا جو انہوں نے نہیں کیا تھا۔ انہیں روزے کی حالت میں پولیس سٹیشن لے جایا گیا۔ جب انہیں چھوڑا گیا تو ان کی پیٹھ پر مار پیٹ کے نشانات تھے۔ کسی نے انہیں روزہ افطار کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہ سن کر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

بہت سے شرکاء کے لیے پولیس سٹیشن محفوظ جگہیں نہیں تھیں۔ یہ وہ مقامات تھے جن سے بچنا ضروری تھا چاہے انہیں کوئی نقصان ہی کیوں نہ پہنچا ہو۔

ان لوگوں کو یہی مشکل ہسپتالوں میں بھی پیش آتی رہی۔ ایک شخص نے بتایا کہ جب اس نے علاج کی درخواست کی تو ڈاکٹر نے انہیں اس وقت کے بارے میں سوچنے کو کہا جو اس نے جنسی تعلقات میں گزارے تھے۔

ان کی آواز میں غصہ نہیں بلکہ صرف تھکن تھی۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ ان کے راز افشا کیے گئے۔ ڈاکٹر سرجری کرنے سے انکار کرتے تھے اور علاج صرف مخصوص حالات میں ملتا تھا۔

محفوظ ٹھکانے

ان لوگوں نے بتایا کہ خوف کے باوجود کچھ جگہیں محفوظ بھی محسوس ہوتی تھیں۔ جب شرکا نے 'دوستانہ' اور دیگر سماجی تنظیموں کے بارے میں بات کی تو ان کی آوازوں میں نرمی آ گئی۔ یہ وہ جگہیں تھیں جہاں وضاحت مانگے بغیر مدد دی جاتی ہے، جہاں تشخیص کے آلات بغیر کسی نکتہ چینی کے فراہم کیے جاتے ہیں اور جہاں ہر کوئی آپ سے آپ کی موجودگی کا جواز مانگے بغیر مدد کرتا ہے۔

ایک شخص نے بتایا کہ ان جگہوں پر لوگ ہمیشہ ان کی مدد کرتے اور ان کی بات سنتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان مباحثوں میں کلینک جانے میں ہچکچاہٹ، پولیس سٹیشن کا خوف، کام کی جگہ اور روزمرہ زندگی میں امتیاز جیسے مشترکہ تجربات سامنے آئے۔

غیر یکساں اور نامکمل قوانین

اگرچہ پاکستان میں مجموعی طور پر 'ایچ آئی وی' کے پھیلاؤ کی شرح کم ہے (0.2% سے بھی نیچے) لیکن 2010 سے 2020 کے درمیان نئے مریضوں کی تعداد میں 84 فیصد اضافہ ہوا۔ یہ ایک ایسے بڑھتے ہوئے بحران کی نشاندہی کرتا ہے جو صرف طبی نہیں بلکہ قانونی اور سماجی نوعیت کا بھی ہے۔

جائزے میں یہ بھی سامنے آیا کہ صحت کے معاملات صوبوں کو دینے کی وجہ سے 'ایچ آئی وی' سے متعلق قوانین غیر یکساں اور نامکمل ہیں۔ سندھ واحد صوبہ ہے جہاں 'ایچ آئی وی' کے لیے مخصوص قانون موجود ہے جبکہ پنجاب، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں ایسے قانونی تحفظات موجود نہیں ہیں جو 'ایچ آئی وی' سے متعلق خلاف ورزی کو روک سکیں اور جہاں قوانین موجود ہیں وہاں ان پر عملدرآمد کمزور ہے۔

علاج معالجے میں امتیازی سلوک

اس حوالے سے ایک آن لائن جائزے کے مطابق، 'ایچ آئی وی' سے متعلق طبی آگاہی خاطر خواہ ہے۔ جن لوگوں سے بات کی گئی ان میں سے 94 فیصد جانتے تھے کہ 'ایچ آئی وی' کس طرح منتقل ہوتا ہے۔ تاہم، یہ علم اس مرض سے حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔

42 فیصد شرکا بالخصوص ٹرانس جینڈر افراد اور منشیات استعمال کرنے والوں نے طبی خدمات کی فراہمی کے حوالے سے امتیازی سلوک کی شکایت کی۔ نصف سے زیادہ نے پولیس کی جانب سے امتیاز کی اطلاع دی جبکہ ٹرانس جینڈر

افراد اور جنسی کارکنوں نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے جنسی زیادتی، بلیک میلنگ اور ہراسانی کے ہولناک واقعات بیان کیے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا سرکاری اداروں پر اعتماد برقرار نہیں رہا۔ 56 فیصد متاثرین بدنامی یا پولیس کے ناروا سلوک کے خوف سے شکایات درج نہیں کرواتے۔

17 فیصد نے وکلا یا ججوں کی جانب سے امتیازی سلوک کی اطلاع بھی دی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے عدالت جانا بھی مشکل ہے۔

تحقیر سے پاک زندگی کا حق

ان خامیوں کے باوجود امید کی گنجائش موجود ہے۔ عدالتیں اب زندگی اور وقار کے آئینی حقوق کی تشریح اس طرح کر رہی ہیں کہ یہ صرف زندہ رہنے کا حق نہیں بلکہ ایک ایسی زندگی گزارنے کا حق ہے جو تحقیر سے آزاد ہو۔

2025 کے قانونی حالات کے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ طبی مدد علاج میں مدد دے سکتی ہے لیکن سماج میں بدنامی اور امتیاز ختم کرنے کے لیے قانون کا موثر کردار ضروری ہے۔ 'ایچ آئی وی' کے حوالے سے بلا امتیاز اقدامات کے لیے قانونی بااختیاری، ادارہ جاتی جواب دہی اور خاص طور پر انسانی وقار کا احترام ضروری ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں، صحت کے محکموں، عدالتوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے تیار کی جانے والی یہ سفارشات انہی لوگوں کے تجربات پر مبنی ہیں۔ ان کا مقصد نفاذ اور ادارہ جاتی ردعمل کو بہتر کرنا اور یہ یقینی بنانا ہے کہ خوف یا امتیاز کی وجہ سے 'ایچ آئی وی' کے مریضوں کی نگہداشت تک رسائی متاثر نہ ہو۔

یہ فیچر پہلے انگلش میں یہاں شائع ہوا تھا جس کا اردو ترجمہ عبداللہ زاہد نے کیا ہے۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

06 بھٹہ مزدور بازیاب

عمرکوٹ پولیس تھانہ کنری کی پولیس نے سیشن کورٹ عمرکوٹ کے حکم پر نبی سرتھر کے قریب اکرم پٹھان کے اینٹوں کے بھٹے پر چھاپہ مار کر جبری مشقت کے شکار 06 بھٹہ مزدور ہر ایک دھرموں، رتنی، کیسری، کملیش، اشوک کمار اور دیگر کو چمن کولہی کی درخواست پر بازیاب کرالیا۔ بھٹہ مزدروں نے الزام لگاتے ہوئے کہا کہ بھٹہ مالک حساب کتاب نہیں کرتا تھا اور زبردستی جبری مشقت کراتا تھا۔ عدالت نے بازیاب ہونے والے تمام بھٹہ مزدوروں کو ان کی مرضی اور پسند کے مطابق آزاد زندگی گذارنے کی اجازت دے دی۔ ایک دوسرے وقوعے میں پولیس تھانہ نبی سر کی پولیس نے سیکنڈ ایڈیشنل سیشن جج عمرکوٹ کے حکم پر نبی سر کے قریب نواب الدین پٹھان کے اینٹوں کے بھٹے پر چھاپہ مار کر جبری مشقت کے شکار کولہی قبیلے کے 11 بھٹہ مزدور ہر ایک مولی، بھوری، مول، نوو، نانجی، دودو اور دیگر کو شوجی کولہی کی درخواست پر بازیاب کرالیا۔ درخواست میں 16 مزدوروں کا ذکر تھا۔ اس سلسلے میں پولیس کا کہنا تھا کہ باقی میلے پر گئے ہوئے تھے۔ جو کہ خود عدالت میں پیش ہوں گے۔ بھٹہ مزدروں نے الزام لگاتے ہوئے کہا کہ بھٹہ مالک حساب کتاب نہیں کرتا تھا اور زبردستی جبری مشقت کراتا تھا۔ عدالت نے بازیاب ہونے والے تمام بھٹہ مزدوروں کو ان کی مرضی اور پسند کے مطابق آزاد زندگی گذارنے کی اجازت دے دی۔

(نامہ نگار)

ماموں کے ہاتھوں بھانجا ہلاک

کنری 2 فروری کو تحصیل کنری کے علاقے تھری کیبل فارم کے قریب گوٹھ جانن چانڈیو میں یاسین چانڈیو نامی شخص نے کلہاڑی کے سیدھے وار کر کے اپنی سگی بہن نیامت، اور 9 سالہ بھانجے (نیامت کا بیٹا) پوڑھو چانڈیو کو سخت زخمی کر دیا۔ ملزم واقعے کے بعد جائے وقوع سے فرار ہوگیا۔ واقعے کی اطلاع پر نبی سر روڈ پولیس نے دونوں زخمیوں ماں اور بیٹے کو علاج و معالج کے لئے صحت مرکز نبی سر روڈ منتقل کیا گیا۔ جہاں معصوم۔ بچے پوڑھو کی حالت نازک ہونے کے باعث سول ہسپتال حیدرآباد منتقل کیا گیا۔ جبکہ نیامت صحت مرکز نبی سر روڈ میں ہی زیر علاج رہی۔ پولیس نے چھاپہ مار کر ملزم یاسین چانڈیو کو حراست میں لے لیا۔ بتاریخ 4 فروری کو سول ہسپتال حیدرآباد میں زیر علاج معصوم بچہ زخموں کی تاب نہ سہتے ہوئے ہلاک ہوگیا۔ مقتول معصوم پانچ بہنوں کا اکیلا بھائی تھا۔ ملزم یاسین چانڈیو اپنی سگی بہن نیامت چانڈیو کے ہی گھر میں رہتا تھا۔ پولیس کے مطابق ملزم کا ذہنی توازن درست نہیں۔ بہرحال ملزم ماموں نے اپنے بھانجے کو ہلاک کر دیا۔

(نامہ نگار)

25 سال سے کم عمر لوگوں کو درپیش نفسیاتی بحران

مہک سندھو

بحث یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ آج، میرا مقصد ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ نازک لیکن بڑے پیمانے پر نظرانداز کیے جانے والے مسائل میں سے ایک کو اجاگر کرنا ہے — ایک ایسا مسئلہ جس پر کھل کر بات کرنا اکثر نامناسب سمجھا جاتا ہے۔ زیر بحث موضوع ہے "25 سال سے کم عمر لوگوں کو درپیش نفسیاتی بحران"۔

اگر ہم اپنے اردگرد کا بغور مشاہدہ کریں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نفسیاتی مشکلات کا شکار ہے۔ تاہم، زیادہ تر لوگ ذہنی صحت سے متعلق خدشات کے بارے میں خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، جیسے کہ ان پر بحث کرنا سماجی لحاظ سے ممنوع یا اخلاقی ناکامی ہو۔ کسی حد تک یہ خاموشی قابل فہم ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی فرد کھلے عام ڈپریشن، اضطراب یا گھبراہٹ کے جذبات کا اظہار کرتا ہے، تو اسے معاشرے کی طرف سے "ذہنی طور پر غیر مستحکم" یا "خلاف معمول طرز عمل کا حامل" شخص تصور کیا جاتا ہے۔

ان غلط فہمیوں کے باوجود، نفسیاتی بحران صحت کی ایسی حالتیں ہیں جن پر گفتگو ہو سکتی ہے اور یہ کسی بھی طرح سے معیوب علامات نہیں ہیں۔ وہ متعدد معاون عوامل سے پیدا ہوتے ہیں اور علامات کی ایک وسیع سلسلے کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔ عام طور پر سامنے آنے والی علامات میں روزمرہ کی سرگرمیوں میں دلچسپی کا کم ہونا، نیند میں خلل، توجہ مرکوز کرنے میں دشواری، غصہ، مسلسل اداسی، ناامیدی کے جذبات، سماجی دستبرداری، اور خود کو نقصان پہنچانے کے خیالات شامل ہیں۔ شدید حالتوں میں، گھبراہٹ کے حملے ہو سکتے ہیں، جو بافتوں میں کم آکسیجن کی وجہ سے جان لیوا بن سکتے ہیں۔

تحقیق کے بنیادی نکات

اس مضمون کے نتائج کی حمایت تقریباً 63 سے 65 جواب دہندگان سے جمع کردہ اعداد و شمار سے ہوتی ہے، جن میں سے اکثریت یونیورسٹی کے طلباء (تقریباً 67 فیصد) تھی۔ ان میں سے بیشتر وہ نوجوان تھے جو اپنے نوعمری کے آخری مرحلے سے بیس برس کے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ ان میں لڑکیوں کی سادہ اکثریت ہے۔

نفسیاتی تناؤ کا پھیلاؤ

نتائج واضح طور پر بتاتے ہیں کہ نوجوانوں میں نفسیاتی تناؤ حقیقی اور مروجہ دونوں طرح کا ہے۔ 52 فیصد سے زیادہ جواب دہندگان نے نفسیاتی تناؤ یا بحران کا سامنا کرنے کی اطلاع دی، جب کہ 38 فیصد نے ایسے تجربات سے انکار کیا، اور تقریباً 10 فیصد غیر یقینی تھے۔ اس تحقیق سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ ذہنی صحت کے حوالے سے لوگوں میں الجھن اور بیداری کی کمی بہت نمایاں ہے۔

مزید برآں، تقریباً نصف جواب دہندگان نے تناؤ، بے چینی، یا اداسی محسوس ہونے کی اطلاع دی، جب کہ ایک قابل توجہ گروپ نے ان جذبات کا مسلسل سامنا کرنے کی اطلاع دی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نوجوانوں کی ذہنی پریشانی کبھی کبھار نہیں ہوتی بلکہ مسلسل رہتی ہے۔

اہم عوامل

نفسیاتی بحران کے بنیادی عوامل میں درج ذیل شامل ہیں:

- خاندانی توقعات اور دقیانوسی تصورات (تقریباً 35 فیصد)
- کیریئر اور مستقبل سے متعلق خدشات (تقریباً 24 فیصد)
- تعلیمی دباؤ (تقریباً 16 فیصد)
- ہم مرتبہ کا موازنہ اور سماجی دباؤ
- مالی امور اور تعلقات سے متعلق تناؤ خاص طور پر، خاندان کی توقعات سب سے زیادہ متاثر کن تناؤ کے طور پر سامنے آئی ہیں جس سے نوجوانوں کی نفسیاتی پریشانی کی ثقافتی جہت نمایاں ہوئی ہے۔

80 فیصد سے زیادہ شرکاء نے بتایا کہ خاندان کی توقعات ان کی ذہنی صحت کو نمایاں طور پر یا کم از کم کبھی کبھار متاثر کرتی ہیں جس سے نوجوان افراد پر جذباتی دباؤ کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ سماجی اور ثقافتی دقیانوسی تصورات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جواب دہندگان کی بڑی تعداد نے بتایا کہ ان عوامل نے ان پر منفی نفسیاتی اثرات مرتب کیے ہیں۔

سماجی تنہائی اور سوشل میڈیا کا کردار

بدقسمتی سے، بہت سے نوجوان خاندان یا معاشرے کے ساتھ اپنے مسائل کے بارے میں کھل کر بات کرنے سے قاصر ہیں۔ اس صورت حال کا سامنا کرنے کے طریقہ کار کے طور پر، وہ اکثر سماجی پسپائی اختیار کرتے ہیں یا سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر ضرورت سے زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ طویل سماجی علیحدگی فرد کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے اور پریشان کن خیالات پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہے، اور سنگین صورتوں میں خودکشی کا رویہ جنم لیتا ہے

سوشل میڈیا کا بے تحاشہ استعمال نفسیاتی پریشانی کو مزید بڑھاتا ہے۔ آن لائن پلیٹ فارمز پر پیش ہونے والی تصوراتی اور غیر حقیقت پسندانہ طرز زندگی حقیقت سے بالکل مختلف ہے، جس کی وجہ سے مسلسل موازنہ، احساس کمتری، تنہائی، اور نوجوانوں میں شدید نفسیاتی پریشانی کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔

علامات اور شدت

سب سے زیادہ رپورٹ ہونے والی علامات میں درج ذیل شامل ہیں:

- دلچسپی کا فقدان (46.8 فیصد)
- نیند میں خلل (41.9 فیصد)
- توجہ مرکوز کرنے میں دشواری (37.1 فیصد)
- مسلسل اداسی اور لاچارگی
- سماجی دستبرداری

تشویشناک بات یہ ہے کہ تقریباً 11 فیصد کی طرف سے خود کو نقصان پہنچانے کے خیالات اور تقریباً 9-10 فیصد جواب دہندگان کی طرف سے گھبراہٹ کے حملوں کی اطلاع دی گئی — ایسی علامات جو طبی لحاظ سے اہم ہیں اور انہیں مبالغہ آرائی یا جذباتی کمزوری کے طور پر رد نہیں کیا جانا چاہیے۔

تعلیم اور مدد کی خواہش پر اثرات

جواب دہندگان کی اکثریت نے بتایا کہ نفسیاتی پریشانی کا ان کی تعلیمی کارکردگی پر اعتدال سے شدید حد تک اثر پڑا ہے۔ اس کے باوجود، صرف 22.2 فیصد نے دماغی صحت کے پیشہ ور سے مشورہ کیا، جبکہ تقریباً 78 فیصد نے کبھی پیشہ ورانہ مدد نہیں لی۔ نفسیاتی ضرورت اور مدد کے متلاشی رویے کے درمیان یہ فرق مطالعہ کے سب سے زیادہ متعلقہ نتائج میں سے ایک کی نمائندگی کرتا ہے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا معاشرے میں دماغی صحت کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے تو نصف سے زیادہ جواب دہندگان نے کا جواب نفی میں تھا۔ یہ جواب نظرانداز کیے جانے، غلط فہمی اور رد کیے جانے کے وسیع تر احساس کی عکاسی کرتا ہے۔

نوجوانوں کی آوازیں

تحقیق کے دوران موصول ہونے والے جوابات سے پہلے سے معلوم موضوعات ایک بار پھر کھل کر سامنے آئے ہیں: والدین کی دیکھ بھال کے موازنہ کو روکنے کی ضرورت، تعلیمی اداروں میں مشاورتی خدمات کا مطالبہ، اور فیصلہ کرنے کے بجائے سننے کی خواہش۔ ایک خاص طور پر پُرجوش بیان اس تحقیق کے جذباتی مرکز کو سمیٹتا ہے: "کچھ دوا کی ضرورت تھی، لیکن اس سے بڑھ کر، مجھے سننے اور رونے کی اجازت دینے کی ضرورت تھی۔"

ماحصل

25 سال سے کم عمر لوگوں کو درپیش نفسیاتی بحران ایک خاموش لیکن صحت عامہ سے متعلق بڑھتی ہوئی تشویش کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس تحقیق کے نتائج آگہی، ابتدائی نفسیاتی جانچ، تعلیمی اداروں میں دماغی صحت کی خدمات، اور نوجوانوں کی ذہنی صحت کو سمجھنے کے طریقے میں سماجی تبدیلی کی فوری ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ نوجوان افراد کو محض حل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں فہم، ہمدردی، اور فیصلے کے خوف کے بغیر اپنی تکلیف کا اظہار کرنے کے لیے محفوظ مقام و موقع کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

جوزف فرانسس کی انسانی حقوق کی جدوجہد کا باب بند ہوا

ڈاکٹر الفریڈ چارلس

جوزف فرانسس 1945 میں ایک کاتھولک مسیحی گھرانے میں پیدا ہوئے

ملک میں انسانی حقوق کے حوالے سے سرگرم عمل جوزف فرانسس رحلت کر گئے۔ان کے دنیا سے اُٹھ جانے پر انسانی حقوق کے تحفظ اور خلاف ورزیوں پر آواز اٹھانے والی آواز اب خاموش ہوگئی ہے۔بطور انسانی حقوق کے علمبردار ان کی شاندار جدوجہد کا باب بند ہوا لیکن ان کو تادیر یاد رکھا جائے گا۔انھوں نے یہ کٹھن کام بخوبی سرانجام دیا جس پر کیا اپنے اور کیا پرائے سب ہی ان کے معترف ہیں۔جوزف فرانسس نے اپنے اعمال و کردار سے انسانی حقوق کے حوالے سے جو بھی کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یوں انھوں نے اس میدان میں جس طرح کا کام کیا اور نام کمایا وہ اب دوسروں کے لئے عملی نمونہ و چیلنج ہے۔اقلیت،کمزور و پسماندہ افراد کی مدد کو ہر لحہ تیار رہنے والے جوزف فرانسس کو تاریخ میں اچھے نام کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔انھوں نے قریباً پانچ دہائیوں تک اپنی انتھک اور بے لوث خدمات فراہم کیں اور بڑا نام کمایا۔ان کی اس جدوجہد پر ان کی رحلت پر ہر طبقہ فکر کی جانب سے خراج تحسین پیش کیا جارہا ہے۔

جوزف فرانسس 1945 میں ایک کاتھولک مسیحی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم لاہور کے رنگ محل مشن ہائی اسکول سے حاصل کی۔زمانہ طالب علمی سے ہی آپ سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔اسی روش کو لیکر آگے بڑھے اور انسانی حقوق کی پامالیوں کو دیکھ کر اس میدان میں عملی طور پر کام شروع کیا۔1965 کی پاک بھارت جنگ کے دوران انھوں نے کھل کر ایسے مسیحی افراد کی مدد کا بیڑا اٹھایا جن کو حراست میں لیا گیا یا جبری غائب کر دیا گیا۔ان پر یہ بے بنیاد الزام لگایا گیا کہ ان لوگوں نے بھارت کے لئے جاسوسی کی ہے۔جوزف فرانسس نے ان حالات میں جب فوج اور دیگر ایجنسیاں مسیحیوں کو مشکوک جان کر یہ کارروائی کر رہی تھیں لوگوں کو جیلوں میں تلاش کیا اور ان کی رہائی ممکن بنائی۔ان کے اس عمل سے نہ صرف ان گرفتاریوں، جبری گمشدگیوں کی روک تھام ہوئی بلکہ یہ تاثر بھی زائل ہوا کہ سرحدی علاقوں میں موجود مسیحیوں نے بھارتی فوج کے لئے مخبری کی۔یہاں سے جوزف فرانسس کا شروع ہونے والا انسانی حقوق کے لئے کام تادم مرگ جاری رہا۔

اُس وقت بھی ملکی سطح پر کوئی مسیحی سیاسی جماعت وجود نہ رکھتی تھی تو اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے جوزف نے سیاسی میدان میں بھی قدم رکھا۔انھوں نے پاکستان کرسچن نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی اور مسیحیوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم مہیا کیا۔سیاسی طور پر ان کا جھکاؤ اس وقت کی ترقی پسند اور جمہوری نظریات کی علمبردار پیپلز پارٹی کی جانب تھا۔یوں جوزف فرانسس نے قومی دھارے میں کام کرنے والی سیاسی جماعتوں اور انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والی تنظیموں سے مل کر مشترکہ مقاصد کے تحت کام کیا۔بطور ایک سیاسی ورکر اور مسیحی رہنما انھوں نے اس بات پر آواز اٹھائی کہ مسیحیوں اور دیگر غیر مسلموں کو آئین میں درج بنیادی حقوق

> **سیاسی جماعت کے قیام کے باوجود بھی جوزف فرانسس پارلیمانی سیاست میں کوئی خاص مقام نہ بنا پائے۔البتہ انھوں نے بطور انسانی حقوق کے کارکن کے اپنا کام جاری رکھا۔اس دوران ملک میں قانون توہین مذہب کے حوالہ سے مقدمات کا اندراج عام سی بات بن کر سامنے آیا۔**

سے محروم نہ رکھا جائے۔ان کو جلد اس بات کا احساس بھی ہوگیا کہ آئین میں درج انسانی حقوق کی ان شقوں کی پامالی کی جارہی ہے جس سے اقلیتیں متاثر ہورہی ہیں۔انھوں نے اس بات کو زیادہ محسوس کیا کہ ہمیں برابر کے شہری ہونے کا تذکرہ آئین میں تو کیا جاتا ہے لیکن عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔اقلیتوں کے لئے رائج طریقہ انتخاب پر بھی ان کو شدید تحفظات تھے۔

سیاسی جماعت کے قیام کے باوجود بھی جوزف فرانسس پارلیمانی سیاست میں کوئی خاص مقام نہ بنا پائے۔البتہ انھوں نے بطور انسانی حقوق کے کارکن کے اپنا کام جاری رکھا۔اس دوران ملک میں قانون توہین مذہب کے حوالہ سے مقدمات کا اندراج عام سی بات بن کر سامنے آیا۔اس پر جوزف فرانسس نے ایسے افراد کی مدد کرنا شروع کی اور اس قانون کے ذریعے ہونے والی ناانصافیوں اور معصوم و بے گناہ افراد کو ان مقدمات میں گرفتار کرنے پر آواز اٹھائی۔ایک ایسے ہی مقدمے میں گرفتار ہوکر لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں مقید طاہر اقبال کا مقدمہ لڑنے میں بھی پیش پیش تھے۔طاہر اقبال کا قصور یہ تھا کہ اس نے اپنی آزاد مرضی سے مذہب تبدیل کیا تو اس پر قانون توہین مذہب کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کروادیا گیا۔اپنی قید کے دوران طاہر اقبال پراسرار طور پر مردہ پایا گیا جس پر غالب امکان یہ ظاہر ہوا کہ اس کو مبینہ طور پر زہر دیا گیا ہے۔جب ایسے کیسوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو جوزف فرانسس نے اپنے خرچے پر متاثرین کو وکلاء فراہم کئے۔ساتھ ہی انھوں نے قانون توہین مذہب کے بڑھتے ہوئے بے جا استعمال کے خلاف بھی جدوجہد شروع کی۔اس دوران جوزف فرانسس نے اپنی کلاس نامی تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔اس تنظیم کے قیام کا مقصد ایسے افراد کو قانونی معاونت فراہم کرنا تھا جو کسی بھی جھوٹے مقدمے میں ملوث کر دیے گئے ہوں۔کلاس یعنی سینٹر فار لیگل ایڈ اسسٹینس اینڈ سیٹلمنٹ کے تحت لاہور میں بڑے منظم انداز سے کام کیا جارہا ہے۔متاثرین سے رابطہ کرنا اور ان کی قانونی معاونت کے ساتھ ساتھ ان کی دھاڑس بندھاتے ہوئے دوران قید ان کو مضبوط رکھنا اہم کام ہے۔اسی طرح متاثرہ خاندانوں سے قریبی رابطہ رکھنا اور ان کی ہر ممکنہ امداد بھی تنظیم کا خاصا ہے۔محدود وسائل کی موجودگی کے باوجود بھی جوزف فرانسس کی سربراہی میں تنظیم اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔ان کی تیار کردہ رپورٹوں، تجزیوں سے دیگر تنظیمیں بھرپور استفادہ کرتی رہی ہیں۔

ملکی سطح پر جوزف فرانسس نے انسانی حقوق کمیشن کے ساتھ مل کر ایک سرگرم کردار ادا کیا۔اس پر ان کی خاصی ستائش کی جاتی تھی اور ان کو کئی ایک ایوارڈز بھی ملے۔ان کو اعزاز حاصل ہوا کہ یورپی یونین کی جانب سے انکو سخاروف ایوارڈ کے لئے نامزد کیا گیا۔ان کی انسانی حقوق کی شاندار خدمات پر ان کو عاصمہ جہانگیر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔انھوں نے انسانی حقوق کے لئے نمایاں کام کرنے والے افراد عاصمہ جہانگیر اور آئی اے رحمان کے ساتھ مل کر اس حوالے سے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ان کی وفات پر ان کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے انسانی حقوق کمیشن نے اپنے جاری کردہ تعزیتی پیغام میں ان کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔اسی طرح انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والے دیگر نمایاں افراد اور تنظیموں نے بھی ان کی وفات پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔جوزف فرانسس کے بعد اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان کی انسانی حقوق کے لئے خدمات اور جدوجہد کو کیسے جاری رکھا جائے گا۔امید ہے کہ ان کے کام کو اسی طرح آگے بڑھایا جائے گا۔

بچوں کی پیدائش کا اندراج آسان بنانے کی ضرورت، یو این رپورٹ

اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے حقوق اطفال (سی آر سی) نے پاکستان میں نومولود بچوں کی پیدائش کا فوری اور آسان اندراج یقینی بنانے، افغان مہاجر بچوں کے حقوق کا تحفظ اور ہر جگہ نوعمر افراد کے جنسی استحصال کو روکنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ کمیٹی نے اپنے حالیہ اجلاس کے دوران سات رکن ممالک کے جائزے کے بعد بچوں کے حقوق کی صورتحال پر اپنی رپورٹ جاری کی ہے۔ یہ رپورٹ پاکستان میں اقوام متحدہ کے کنونشن برائے حقوق اطفال کے نفاذ سے متعلق خدشات اور متعدد سفارشات کے ساتھ ملک میں بچوں کی صورتحال کے بارے میں چند مثبت باتوں کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ رپورٹ میں پاکستان کے علاوہ کولمبیا، ایتھوپیا، گھانا، ملائشیا، مالدیپ اور سپین میں بچوں کی صورتحال کا جائزہ شامل ہے۔ یہ کمیٹی جنگی مقاصد کے لیے بچوں کی بھرتی، نوعمر افراد کی سمگلنگ، بچوں کو جنسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے اور ان سے متعلق جنسی مواد کی تیاری جیسے جرائم کی نگرانی اور ان کے خاتمے کے لیے کام کرتی ہے۔ اس میں دنیا بھر سے تعلق رکھنے والے انسانی حقوق کے 18 آزاد ماہرین شامل ہیں جو حکومتوں کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے کنونشن کے 196 ریاستی فریق ہی جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔

اندراج پیدائش میں اضافہ

کمیٹی نے پاکستان کے بعض علاقوں میں اندراج پیدائش میں اضافے اور متعلقہ فیس کی معافی کے اقدامات کا خیر مقدم کیا ہے۔ تاہم، غیر مندرج بچوں کی تعداد اب بھی بہت زیادہ ہے۔ کمیٹی نے پیدائش کے اندراج میں حائل رکاوٹوں پر تشویش ظاہر کی ہے جن میں پرانے قوانین، ناقص عملدرآمد اور اندراج کے پیچیدہ طریقہ کار شامل ہیں۔ رپورٹ میں پسماندہ اور نظر انداز کیے گئے طبقات سے تعلق رکھنے والے بچوں کی پیدائش کے اندراج کو یقینی بنانے کے لیے موثر اقدامات کی کمی کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ کمیٹی نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ ملکی قوانین میں ترمیم کرے اور ایسا موثر نظام تشکیل دے جس کے تحت ملک میں پیدا ہونے والے تمام بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد پیدائشی سرٹیفکیٹ جاری کیے جائیں۔ کمیٹی نے پیدائش کے اندراج سے متعلق تمام فیسیں ختم کرنے کا مطالبہ بھی کیا ہے۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

ایمان مزاری اور ہادی چٹھہ کی سزاؤں پر انسانی حقوق کے ماہرین کو تشویش

انسانی حقوق پر اقوام متحدہ کے ماہرین نے پاکستان میں حقوق کے کارکنوں اور وکلا ایمان مزاری حاضر اور ہادی علی چٹھہ کو فوجداری الزامات کے تحت طویل سزائیں دیے جانے پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ماہرین نے کہا ہے کہ دونوں شخصیات کو آزادی اظہار کا استعمال کرنے پر یہ سزائیں دی گئیں۔ وکلا بھی دیگر افراد کی طرح اظہار رائے کی آزادی کا حق رکھتے ہیں۔ اس حق کے استعمال کو مجرمانہ فعل، خصوصاً دہشت گردی کے مترادف نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ انہوں نے پاکستان میں انسداد دہشت گردی کے قانونی فریم ورک میں دہشت گردی سے متعلق جرائم کی وسیع اور مبہم تعریف کے حوالے سے خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس طرح کا طرز عمل ملک بھر میں وکلا اور انسانی حقوق کے کارکنوں کے کام کو کمزور کرنے اور مجرمانہ رنگ دینے کا سبب بن سکتا ہے اور اس سے ملک میں سول سوسائٹی خوف اور دباؤ میں آتی ہے۔

قانون کا ناجائز استعمال

گزشتہ سال 22 اگست کو ایمان مزاری حاضر کے خلاف سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم ایکس پر پوسٹ کرنے اور ان کے شوہر ہادی علی چٹھہ کے خلاف ان پوسٹ کو شیئر اور ری پوسٹ کرنے پر فوجداری کارروائی شروع کی گئی تھی۔ 24 جنوری 2026 کو انہیں الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کے ایکٹ 2016 کی دفعات 9 (جرم کی تمجید)، 10 (سائبر دہشت گردی) اور 26-اے (جھوٹی اطلاعات پھیلانے) کے تحت مجرم قرار دیا گیا۔ دونوں کو دی جانے والی سزاؤں کی مجموعی مدت 17 سال بنتی ہے جن میں سب سے طویل 10 سال کی سزا سائبر دہشت گردی کے جرم میں دی گئی۔ علاوہ ازیں، دونوں شخصیات پر تین کروڑ 60 لاکھ روپے جرمانہ بھی عائد کیا گیا۔ ماہرین نے کہا ہے کہ دونوں وکلا کے خلاف یہ پہلے مقدمات نہیں ہیں۔ 2022 سے اب تک ان کے خلاف 10 فوجداری شکایات درج کی جا چکی ہیں جن میں سے بعض تاحال زیر التوا ہیں۔ تاہم اس سے قبل انہیں کبھی کسی جرم میں سزا نہیں ہوئی۔ ماہرین نے کہا ہے کہ مقدمات کے اس تسلسل سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانونی نظام کو ناجائز طور پر ہراسانی اور دباؤ کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے تاکہ انہیں انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزی کے متاثرین کے لیے آواز اٹھانے پر سزا دی جا سکے۔

مقدمے اور سزا پر سوالیہ نشانہ

اقوام متحدہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ تمام ممالک کی ذمہ داری ہے کہ وکلا کو ان کے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی پر فوجداری کارروائی کا نشانہ نہ بنایا جائے اور نہ ہی وکلا کو ان کے مؤکلین کے ساتھ منسلک کر کے دیکھا جائے۔ دونوں وکلا کے خلاف عدالتی کارروائی غیر معمولی تیزی سے آگے بڑھی۔ اطلاعات کے مطابق، انہیں اپنے دفاع کی تیاری کے لیے مناسب وقت نہیں دیا گیا جبکہ اپنی پسند کے وکیل تک رسائی میں بھی مشکلات کا سامنا رہا اور استغاثہ کے گواہوں کے بیانات ان کی غیر موجودگی میں قلمبند کیے گئے۔ ماہرین نے کہا ہے کہ بین الاقوامی معیارات فوجداری مقدمات کا سامنا کرنے والے افراد کے لیے طریقہ کار سے متعلق متعدد ضمانتیں فراہم کرتے ہیں، مگر اس معاملے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان ضمانتوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ایسی خلاف ورزی نے مقدمے اور سزا کی منصفانہ حیثیت سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ماہرین ان خدشات کے حوالے سے پاکستان کی حکومت کے ساتھ رابطے میں ہیں۔

غیر جانبدار ماہرین و اطلاع کار

غیر جانبدار ماہرین یا خصوصی اطلاع کار اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کے خصوصی طریقہ کار کے تحت مقرر کیے جاتے ہیں جو اقوام متحدہ کے عملے کا حصہ نہیں ہوتے اور اپنے کام کا معاوضہ بھی وصول نہیں کرتے۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

کراچی میں جبری لاپتہ طالبعلم ہمدان کی مبینہ جعلی مقابلے میں ہلاکت، بی وائی سی کا اظہارِ تشویش

کراچی بلوچ یکجہتی کمیٹی (بی وائی سی) نے کراچی کے علاقے شاہ لطیف ٹاؤن میں کاؤنٹر ٹیررازم ڈیپارٹمنٹ (سی ٹی ڈی) کے ہاتھوں مبینہ مقابلے میں ہلاک کیے گئے 24 سالہ طالبعلم ہمدان ولد محمد علی کے واقعے پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ہمدان 29 دسمبر 2025 سے جبری طور پر لاپتہ تھے اور ان کے اہلِ خانہ کے مطابق انہیں ڈبی گوٹھ، گولیمار سے سی ٹی ڈی اہلکاروں نے حراست میں لیا تھا۔ بی وائی سی کے مطابق ہمدان کی گمشدگی کے بعد ان کے خاندان کو ان کی حالت یا مقام کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ کئی ہفتوں بعد سی ٹی ڈی نے اعلان کیا کہ ہمدان ایک مسلح مقابلے میں مارے گئے افراد میں شامل تھے، تاہم کمیٹی کا کہنا ہے کہ ہمدان دسمبر 2025 سے ہی ریاستی تحویل میں تھے، جس سے اس مقابلے کی شفافیت اور قانونی حیثیت پر سنگین سوالات جنم لیتے ہیں۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ کراچی اور بلوچستان میں اس نوعیت کے واقعات مسلسل سامنے آ رہے ہیں، جن میں نوجوانوں کو حراست میں لینے کے بعد مبینہ جعلی مقابلوں میں ہلاک ظاہر کیا جاتا ہے۔ بی وائی سی کے مطابق یہ طرزِ عمل ماورائے عدالت قتل اور جبری گمشدگیوں کے جاری سلسلے کی نشاندہی کرتا ہے، جسے انسدادِ دہشت گردی کے نام پر چھپایا جاتا ہے۔ کمیٹی نے واضح کیا کہ اگر کوئی شخص پہلے سے ریاستی تحویل میں ہو اور بعد میں اسے مسلح جھڑپ میں ہلاک دکھایا جائے تو یہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے قوانین، خصوصاً بین الاقوامی عہدنامہ برائے شہری و سیاسی حقوق (ICCPR) کے آرٹیکل 6 اور 9، کی سنگین خلاف ورزی ہے۔

بی وائی سی نے بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیموں اور انسانی ہمدردی کے اداروں سے فوری مداخلت کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ بلوچستان میں نوجوانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، مسخ شدہ لاشیں برآمد ہو رہی ہیں، اور سی ٹی ڈی، ریاستی پشت پناہی رکھنے والے گروہوں اور سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں مبینہ جعلی مقابلوں میں ہلاکتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ بیان میں کہا گیا کہ جب تک آزادانہ تحقیقات اور موثر احتساب کا نظام قائم نہیں ہوتا، اس تشدد اور استثنا کا سلسلہ رکنے کا امکان نہیں۔

(نامہ نگار)

پاکستان میں 75 لاکھ افراد شدید غذائی عدم تحفظ کا شکار

پاکستان میں گزشتہ سال مون سون کے موسم میں آنے والے سیلاب، اس سے قبل طویل خشک سالی اور متعدد علاقوں میں بدامنی کے باعث 75 لاکھ افراد کو انتہائی شدید درجے کے غذائی عدم تحفظ کا سامنا ہے۔ غذائی تحفظ کے مراحل کی مربوط درجہ بندی (آئی پی سی) کے مطابق ان لوگوں کا تعلق پاکستان کے 45 دیہی اضلاع سے ہے جو زیرِ تجزیہ آبادی کا 21 فیصد ہیں۔ ان میں 12 لاکھ 50 ہزار افراد کو 'آئی پی سی' کے چوتھے درجے میں شمار کیا گیا ہے جس کا مطلب ہنگامی درجے کی غذائی قلت ہوتا ہے۔ دسمبر 2025 تا مارچ 2026 کے عرصہ میں لیے گئے اس جائزے کے دوران 45 ایسے دیہی اضلاع میں غذائی تحفظ کی صورتحال کو پرکھا گیا جو خوراک کی کمی، غذائی قلت اور غربت سے متعلقہ وسیع مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان میں 19 اضلاع بلوچستان، 12 سندھ اور 14 خیبر پختونخوا میں واقع ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی تقریباً 3 کروڑ 56 لاکھ افراد پر مشتمل ہے جو ملک کی دیہی آبادی کا تقریباً 23 فیصد اور کل آبادی کا 14 فیصد بنتی ہے۔ 'آئی پی سی' کا نظام اقوام متحدہ کی سرپرستی میں کام کرتا ہے اور اسے دنیا بھر میں کسی بھی جگہ غذائی عدم تحفظ کی صورتحال جانچنے کا سب سے موثر اور قابل بھروسہ ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

ہنگامی امداد کی ضرورت

زیرِ تجزیہ رہنے والے 45 میں سے 40 اضلاع کے لوگوں کو شدید درجے کے غذائی عدم تحفظ کا سامنا ہے۔ اس حوالے سے کڑے ترین حالات موسیٰ خیل، ژوب، کچھی، ٹانک اور تورغر میں دیکھے گئے۔ 'آئی پی سی' کے تجزیے میں کہا گیا ہے کہ صورتحال کو مزید بگڑنے سے بچانے اور خصوصاً ہنگامی درجے کی غذائی قلت کا شکار افراد کو ممکنہ تباہ کن حالات سے تحفظ دینے کے لیے فوری غذائی امداد کی فراہمی انتہائی ضروری ہے۔

غذائی قلت برقرار رہنے کا خدشہ

'آئی پی سی' کے مطابق، گزشتہ سال اپریل سے ستمبر کے دوران شدید درجے کی غذائی قلت کا سامنا کرنے والے لوگوں کی تعداد میں معمولی سی کمی متوقع ہے اور یہ تعداد کم ہو کر 67 لاکھ (زیرِ تجزیہ دیہی آبادی کا 19 فیصد) پر آ سکتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ زرعی پیداوار میں آنے والی ممکنہ بہتری ہے۔ تاہم موسمیاتی دھچکوں کے تسلسل، محدود آمدنی، روزگار کے مواقع میں کمی اور بعض علاقوں میں بدامنی کے باعث شدید غذائی عدم تحفظ کی سطح بلند رہنے کا خدشہ ہے۔ ممکنہ طور پر اس دوران زیرِ تجزیہ 45 اضلاع میں تقریباً 5 لاکھ 70 ہزار افراد (2 فیصد) ہنگامی جبکہ 61 لاکھ 20 ہزار افراد (17 فیصد) شدید درجے کے غذائی عدم تحفظ کا شکار رہیں گے۔ تاہم، اس بہتری کی بنیادی وجہ زیرِ تجزیہ علاقے میں آنے والے ممکنہ کمی ہوگی۔ تناسب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو شدید یا اس سے بدتر بھوک سے دوچار آبادی کا حصہ تقریباً وہی رہے گا۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

مسخ شدہ لاش برآمد

خیبر ضلع خیبر کے علاقہ جمرود میں ایک سیلابی گزرگاہ (خوڑ) سے ایک مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی ہے، جس کی شناخت مینا دار ولد نیاز بیدار ساکن مستل خیل شاہ کے کے نام سے ہوئی۔ ذرائع کے مطابق ایف سی اہلکار مینا دار کو چند ہفتے قبل نامعلوم افراد نے اغواء کر کے غائب کر دیا تھا، جسکی آج مبینہ طور پر لاش جمرود، قدم کے علاقے میں سیلابی گزرگاہ سے ملی۔ چند مزدور خوڑ سے گزر رہے تھے کہ انہیں جائے وقوعہ پر مٹی سے باہر نکلی ہوئی چادر دکھائی دی۔ چادر ہٹانے پر ایک گڑھے سے لاش برآمد ہوئی، جس پر مقامی انتظامیہ اور پولیس کو اطلاع دی گئی۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر لاش تحویل میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لئے اسپتال منتقل کر دیا ہے جبکہ تحقیقات کا آغاز کر دیا ہے۔

(مسعود شاہ)

ملازمین کی مشکلات ختم کی جائیں

نوشکی نوشکی میں 31 جنوری کو دہشت گردی کے واقعات میں نوشکی کے چار مالیاتی اداروں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ حملہ آور بڑی تعداد میں نقدی بھی لے گئے۔ مالیاتی اداروں کو نذر آتش اور توڑ پھوڑ کی وجہ سے مالیاتی اداروں کے صارفین ملازمین اور پنشنر کو ادائیگیوں کے سلسلے میں انتہائی مشکلات دشواریاں اور مالی مصائب کا سامنا کرنا پڑا رہا ہے۔ رمضان المبارک بھی شروع ہو چکا ہے اور عیدالفطر کی خریداری کے سلسلے میں صارفین کو انتہائی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسری جانب شہر میں بجلی کے ٹرانسفارمر کی خرابی کے باعث شہریوں بالخصوص روزداروں کو سحری افطار اور تراویح اور دیگر عبادات کے لیے انتہائی مشکلات اور دشواریاں پیش آرہی ہے۔ دوسری جانب خواتین کو امور خانہ داری کے سلسلے میں بھی کافی مصائب پیش آرہے ہیں۔ نوشکی کے عوام کی مشکلات اور مصائب کو مدنظر رکھتے ہوئے نوشکی میں مالیاتی اداروں کو فعال بنانے اور بجلی کے ٹرانسفارمر کی مرمت کے لیے ترجیحی بنیادوں پر اقدامات کیے جائیں۔

(محمد سعید)

مہاجر بچوں کے تحفظ کا مطالبہ

کمیٹی نے ملک میں غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کی وطن واپسی کے منصوبے کے تحت افغان بچوں کی ملک بدری پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت ان بچوں کی بڑی تعداد کو افغانستان میں انہیں لاحق خطرات کا جائزہ لیے بغیر ملک بدر کیا گیا اور ان میں ایسے بچے بھی شامل تھے جن کا کوئی سرپرست نہیں تھا۔ رپورٹ میں متنبہ کیا گیا ہے کہ ملک بدری کے اس عمل میں دوران حراست اور سرحدی گزرگاہوں پر بچوں کو خاندان سے علیحدگی، استحصال اور بدسلوکی جیسی انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کمیٹی نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مہاجرین سے متعلق قانون بنائے اور پناہ فراہم کرنے کے لیے ایسا طویل المدتی نظام قائم کرے جس کے تحت مہاجر بچوں بالخصوص افغانستان سے تعلق رکھنے والے بچوں کا اندراج کیا جاسکے اور ان کے مسائل حل ہوسکیں۔ پناہ گزینوں کو ان کی رضامندی کے بغیر ان کے ملک واپس نہ بھیجنے کے اصول کی پاسداری کی جائے اور اس منصوبے پر نظرثانی کی جائے تاکہ بچوں کو سنگین خطرات سے بچایا جاسکے۔

بچوں کے جنسی استحصال پر تشویش

کمیٹی نے پاکستان میں سیاحتی اور مذہبی مقامات، ہوٹلوں اور بس سٹاپ جیسی جگہوں پر بچوں بالخصوص لڑکوں جنسی استحصال کی اطلاعات پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے خطرات سے دوچار بچوں کی شناخت اور ان کے استحصال کی نوعیت اور پھیلاؤ کے جائزے کے لیے فوری اقدامات کا مطالبہ کیا ہے۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ حکومت بچوں کے آن لائن جنسی استحصال اور بدسلوکی کی روک تھام اور اس سے نمٹنے کے لیے قومی پالیسی تیار کرے اور سائبر کرائم سے متعلق تحقیقاتی ادارے کو مضبوط بنائے۔ کمیٹی نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ رپورٹ ہونے والے تمام جرائم کی موثر تحقیقات کرے اور ذمہ داران کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے انہیں سزائیں دے۔

(بشکریہ یواین خبرنامہ)

بجلی کی بندش سے شدید مشکلات

نوشکی نوشکی شہر میں نصف درجن سے زائد بجلی کے ٹرانسفارمر جلنے کی وجہ سے شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ شہریوں کو حصول آب کے لیے انتہائی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تاجر برادری بالخصوص ٹیلرنگ کے شعبے سے تعلق رکھنے والوں کا کاروبار بری طرح متاثر ہوا ہے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے رمضان المبارک میں سحری اور افطاری کے لیے خواتین کو امور خانہ داری کے سلسلے مشکلات پیش آرہی ہیں۔ دوسری جانب تراویح، سحری اور افطار کے اوقات بھی روزہ داروں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ 31 جنوری کو نوشکی میں دہشت گردی کے واقعے کے بعد سے شام 6 بجے سے صبح 9 تک لاک ڈاؤن سے کاروبار متاثر اور عوام مشکلات سے دوچار ہو رہے ہے۔ 6 بجے کے بعد آمدرفت کی بندش کے باعث نوشکی کے شہریوں، خاص طور پر دیہی علاقوں کے باشندوں کو ٹیچنگ ہسپتال تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے مشکلات اور دوسری جانب ہسپتال میں عملہ بھی موجود نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ مریضوں اور بلخصوص ایمرجنسی مریضوں کو طبی امداد کی فراہمی میں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیہی علاقوں کے باشندوں کو صحت کے بنیادی سہولیات میسر نہیں۔ اس مشکل گھڑی میں نوشکی سے منتخب ہونے والے عوامی نمائندوں کی کارکردگی سوالیہ نشان ہے۔ نوشکی کے عوامی اور سماجی حلقوں نے حکام کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے مطالبہ کیا ہے عوام کے مشکلات مصائب اور دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کو ریلیف دینے اور انھیں بنیادی سہولیات کی فراہمی ممکن بنانے کے لیے ترجیحی بنیادوں پر اقدامات کیے جائیں۔

(محمد سعید)

بنیادی سہولیات کی فراہمی کا مطالبہ

خیبر جمرود میں تحصیل کونسل ممبران اور متحدہ آزاد پینل کی قیادت میں تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن (ٹی ایم اے) جمرود کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ مظاہرین نے تاریخی مقام باب خیبر پر جمع ہو کر ٹی ایم اے کے خلاف شدید نعرے بازی کی اور ادارے کی کارکردگی پر سخت تنقید کی۔ احتجاج کی قیادت متحدہ آزاد پینل کے صدر شاہد خان، چیئرمین وی سی 11 عرفان آفریدی اور چیئرمین وی سی 10 حاجی حبیب الرحمٰن نے کی۔ اس موقع پر مقررین نے کہا کہ ٹی ایم اے جمرود عوام کو بنیادی شہری سہولیات کی فراہمی میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے، جس کے باعث شہریوں کو صفائی، نکاسی آب اور دیگر بلدیاتی خدمات میں شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ گزشتہ آٹھ سال کی آڈٹ رپورٹ فوری طور پر تحصیل کونسل میں پیش کی جائے اور ادارے کا مکمل احتساب کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ٹی ایم اے میں غیر مقامی افراد کی بھرتی سے مقامی نوجوانوں میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے، لہٰذا آئندہ بھرتیوں میں مقامی افراد کو ترجیح دی جائے جبکہ غیر مقامی ملازمین کو فوری طور پر ٹرانسفر کیا جائے۔ مقررین نے مزید مطالبہ کیا کہ ٹی ایم اے کے مستقل اور ڈیلی ویجز ملازمین کی مکمل فہرست تحصیل کونسل کو فراہم کی جائے۔ چار سال سے تعینات مبینہ طور پر کرپٹ ٹی او آرز بیر کو فوری تبدیل کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ جمرود کو اپنا مستقل ٹی ایم او تعینات کرنے اور دو تحصیلوں کی منظوری دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ تحصیل چیئرمین کے حوالے سے مظاہرین کا کہنا تھا کہ گزشتہ ایک سال سے قائم مقام حیثیت میں ذمہ داریاں ادا کی جارہی ہیں مگر کارکردگی تسلی بخش نہیں۔ مظاہرین نے نیبر ہوڈ کونسلز کو صفائی کے لیے باقاعدہ اور مستقل عملہ فراہم کرنے کا بھی مطالبہ کیا تاکہ شہریوں کو بہتر بلدیاتی سہولیات میسر آسکیں۔ احتجاج کے اختتام پر مظاہرین نے خبردار کیا کہ اگر مطالبات پر فوری عمل درآمد نہ کیا گیا تو احتجاج کا دائرہ وسیع کیا جائے گا۔

(منظور آفریدی)

37 تعلیمی ادارے تاحکمِ ثانی بند

خیبر ضلع خیبر میں حالیہ پاک افغان کشیدگی کے پیش نظر ضلعی انتظامیہ نے اہم فیصلہ کرتے ہوئے سرحدی علاقوں میں قائم 37 سرکاری و نجی تعلیمی اداروں کو تاحکم ثانی بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ سیکیورٹی خدشات اور سرحدی صورتحال کے باعث کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر خیبر کے مطابق تحصیل لنڈی کوتل کے سرحدی علاقوں میں واقع طلبہ و طالبات کے تمام متعلقہ سکولوں کو فوری طور پر بند کرنے کی ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ بند کیے گئے اداروں میں طلبہ کے 29 اور طالبات کے 8 سکول شامل ہیں۔ ضلعی انتظامیہ کے مطابق یہ تمام تعلیمی ادارے لنڈی کوتل، بازار زخہ خیل اور شلمان کے علاقوں میں واقع ہیں، جو سرحد کے قریب ہونے کے باعث حساس قرار دیے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ضلعی محکمہ تعلیم کو باقاعدہ مراسلہ جاری کر دیا گیا ہے تاکہ فیصلے پر مکمل عملدرآمد یقینی بنایا جا سکے۔ ڈپٹی کمشنر کا کہنا ہے کہ افغانستان کی جانب سے مبینہ اشتعال انگیزی اور موجودہ سرحدی کشیدگی کے باعث یہ اقدام طلبہ، طالبات اور اساتذہ کی جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ ضلعی انتظامیہ نے واضح کیا ہے کہ حالات کا مسلسل جائزہ لیا جا رہا ہے، اور جیسے ہی صورتحال میں بہتری آئے گی، تعلیمی سرگرمیوں کی بحالی سے متعلق نیا فیصلہ کیا جائے گا۔

(مسعود شاہ)

لیڈی ہیلتھ ورکر پر حملہ

میانوالی تفصیلات کے مطابق وزیر اعلیٰ پنجاب کے احکامات پر لیڈی ہیلتھ ورکر گھر گھر سروے کر رہی ہیں کہ اس دوران 27 فروری کو (ی) نامی ہیلتھ ورکر لنڈا بانگی خیل سے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے واپس گھر آ رہی تھی کہ جنڈ رہینہ کے مقام پر جھاڑیوں میں چھپے نامعلوم اوباش نوجوان نے ان کا راستہ روک کر دست درازی شروع کر اور زبردستی ویرانے میں لے جانے کی کوشش کی۔ لیڈی ہیلتھ ورکر نے شور مچایا اور پتھر اٹھا کر اپنی حفاظت کی۔ ملزم کے خلاف تھانہ کالاباغ میں درخواست دائر کی گئی ہے۔ پولیس نے ملزم کی گرفتاری کیلیے چھاپے مارنا شروع کر دیئے ہیں۔

(محمد رفیق)

پیکا ایکٹ کے اثرات پر تقریب کا اہتمام

ملتان پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ڈیننگ لاء کالج ملتان کے تعاون سے پیکا ایکٹ اور 26-2025 میں اس کے اثرات کے بارے میں آگاہی سیشن کا انعقاد کیا۔ پروگرام کے اہتمام کا فریضہ ایچ آر سی پی اسٹاف کی رکن محترمہ انیلہ انجام دیا۔ مقررین میں پروفیسر سردار شہمیر، پروفیسر عائشہ، محترمہ لبنیٰ (کونسل ممبر، ایچ آر سی پی) اور جناب نذیر احمد (سابق کونسل ممبر، ایچ آر سی پی) شامل تھے۔ اجلاس کی صدارت ایچ آر سی پی پنجاب چیپٹر کے وائس چیئر راجہ اشرف نے کی۔ پروفیسر سردار شہمیر نے کہا کہ قوانین کا مقصد شہریوں کی زندگی آسان بنانا ہے لیکن پیکا ملک میں مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ پروفیسر عائشہ نے وضاحت کی کہ پوری تاریخ میں حکمرانوں نے اکثر اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے قوانین کا استعمال کیا ہے۔ محترمہ لبنیٰ نے کہا کہ مناسب طریقہ کار کی کمی نے پیکا قانون کے پس پردہ ارادوں پر سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ راجہ اشرف نے سیاست میں مذہب کے استعمال کی مثالیں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح حکمرانوں نے مختلف اوقات میں پاکستان میں عدم برداشت اور انتہا پسندانہ سوچ کی حوصلہ افزائی کے لیے مذہب کا استعمال کیا ہے۔

(نامہ نگار)

ایران پر حملوں کے خلاف احتجاج، پاکستان میں 26 افراد ہلاک

ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ علی خامنہ ای کی امریکہ اور اسرائیل کے حملوں میں ہلاکت کے بعد پاکستان کے مختلف شہروں میں ہونے والے مظاہروں میں سکیورٹی اہلکار سمیت 26 افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے ہیں۔ اتوار کو گلگت بلتستان کے دو بڑے شہروں گلگت اور سکردو میں امریکہ کے خلاف احتجاجی مظاہرے پرتشدد مظاہروں میں بدل گئے۔ اور مظاہرین نے غیر ملکی دفاتر، سرکاری و عسکری املاک کو نقصان نذر آتش کر دیا۔ مظاہرین اور سکیورٹی فورسز میں تصادم کے نتیجے میں ایک سکیورٹی اہلکار سمیت کل 14 افراد ہلاک ہوگئے۔ گلگت ہسپتال میں سات جبکہ سکردو ہسپتال میں سات لاشیں لائی گئی ہیں۔ سکردو ہسپتال کی انتظامیہ نے بتایا کہ کل 45 زخمی ہسپتال میں داخل ہیں جن میں سے تین کی حالت تشویشناک ناک ہے، جبکہ گلگت ہسپتال میں کل 14 افراد زیرِ علاج ہیں۔ سکردو میں بگڑتی صورت حال کے تحت کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اور گلگت اور سکردو کے تمام تعلیمی ادارے بند رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ گلگت میں موبائل فون اور انٹرنیٹ سروس بھی معطل کر دی گئی ہے۔ صوبہ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں ایرانی سپریم لیڈر کی امریکی حملے میں موت کے خلاف ہونے والا احتجاج اچانک پرتشدد جھڑپوں میں تبدیل ہوگیا جس کے نتیجے میں کم از کم 9 افراد ہلاک اور 36 سے زائد زخمی ہوئے۔ آئی آئی چندریگر روڈ سے ٹاور تک جمع ہونے والے مظاہرین کی تعداد وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ہی دیر میں صورت حال کشیدہ ہونا شروع ہوگئی۔ پولیس حکام کا کہنا ہے کہ مظاہرین کو امریکی سفارت خانے کی حدود سے دور رکھنے کے لیے پہلے سے سکیورٹی انتظامات موجود تھے، تاہم کچھ افراد نے آگے بڑھنے کی کوشش کی جس کے بعد پولیس اور مظاہرین کے درمیان تصادم شروع ہوگیا۔ عینی شاہدین کے مطابق 'مظاہرین کی جانب سے پتھراؤ کیا گیا جبکہ قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس کا استعمال کیا'۔

اسلام آباد میں مظاہرین منتشر

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں پولیس نے ڈی چوک اور سرینا چوک کے اطراف میں موجود مظاہرین کو منتشر کر دیا جبکہ سری نگر ہائی وے دوبارہ ٹریفک کے لیے کھول دی گئی ہے۔ سہ پہر کو مظاہرین آبپارہ کے قریب جمع ہوئے اور پھر ڈپلومیٹک انکلیو میں امریکی سفارت خانے کی جانب مارچ کیا۔ تاہم شرکا کی جانب سے آگے بڑھنے پر ریڈ زون کے داخلی راستے بند کر دیے گئے اور پولیس نے مظاہرین کی پیش قدمی روک دی۔ بعدازاں مظاہرین نے ڈی چوک کی طرف رخ کیا جہاں پولیس کے ساتھ جھڑپیں ہوئیں۔ پولیس کی جانب سے مظاہرین پر آنسو گیس کی شیلنگ کی گئی جس کے نتیجے میں متعدد افراد زخمی ہوئے اور تین مظاہرین کے ہلاک ہونے کی غیر مصدقہ اطلاعات ہیں۔

(بشکریہ پاکستان 24 ٹی وی)

قانون نافذ کرنے والے ادارے

شاہراہ کی بندش کا مسئلہ

خیبر ضلع خیبر کے قبیلہ اکاخیل میں محمد علی چوک چیک پوسٹ کے ساتھ روڈ پر دیوار کھڑی کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے پورا روڈ بند ہو چکا ہے۔ یہ مسئلہ پچھلے ایک سال سے جاری ہے، جس کی وجہ سے مقامی افراد شدید مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ دیوار کی تعمیر نے روڈ کی نقل و حرکت کو متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے عوام کے روزمرہ کے معمولات اور کاروبار پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ قبیلہ اکاخیل کے لوگوں نے اس مسئلے کے حل کے لیے متعدد بار اعلیٰ سول اور عسکری حکام سے درخواست کی تھی کہ اس تجاوزات کو ختم کیا جائے اور روڈ کو عوام کے لیے کھولا جائے۔ لیکن اب بھی اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا۔ اب ایک مرتبہ پھر اکاخیل کے لوگوں نے یہ درخواست کی ہے کہ فوری طور پر دیوار ہٹائی جائے تاکہ روڈ عوام کے لیے کھولا جائے اور ان کی مشکلات کا ازالہ ہو سکے۔ یہ اقدامات سراسر ظلم اور ناانصافی کی علامت ہیں کیوں کہ عوام کے حقوق اور ضروریات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے روزمرہ کے معاملات کو متاثر کیا جا رہا ہے۔ دیوار کی تعمیر نے مقامی لوگوں کے لیے نہ صرف سفر میں مشکلات پیدا کی ہیں بلکہ ان کی معیشت اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ عوام کی آواز سننا اور ان کے مسائل کو حل کرنا حکومتی اداروں کی ذمہ داری ہے، اور اس میں کسی بھی قسم کی تاخیر مزید مسائل پیدا کرے گی۔

(مسعود شاہ)

فائرنگ سے نوجوان زخمی

خیبر نوجوان ثاقب ولد سوداگر جو کہ شاکس کار رہائشی ہے موٹر کار میں سوار تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا بندہ بھی موٹر کار میں موجود تھا۔ انہوں نے سیکورٹی اہلکاروں کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ جس کے بعد اہلکاروں نے معمولی تلخ کلامی پر ان پر فائرنگ کر دی۔ جس کے نتیجے میں ثاقب اور اس کے ساتھ بیٹھا دوسرا لڑکا جس کا نام عمر ولد شمیم زخمی ہو گئے۔ سیکیورٹی اہلکار دونوں کو زخمی حالات میں ہسپتال لے گئے جو تا حال ان کی تحویل میں ہیں۔

(منظور آفریدی)

پولیس فائرنگ سے نوجوان جاں بحق، اہلکار زخمی، عوام کا احتجاج

خیبر باڑہ کے تھانہ میلورڈ اور اکاخیل پولیس اہلکاروں کی فائرنگ سے ایک نوجوان شہری جاں بحق اور ایک پولیس اہلکار زخمی ہو گیا۔ واقعہ باڑہ کی حدود میں برقمبر خیل کے علاقے کراول میں پیش آیا۔ مقامی ذرائع کے مطابق تھانہ میلورڈ کے اہلکار مغرب خان اپنے سکواڈ کے ہمراہ ناکہ بندی کر رہے تھے کہ ایک گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا گیا۔ گاڑی نہ رکنے پر پولیس نے فائرنگ کی، جس کے نتیجے میں نور واحد ولد شال مست شدید زخمی ہو گیا اور موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ فائرنگ کے دوران ایک پولیس اہلکار، جو پشاور کا رہائشی اور پولیس میں ٹی آر پی ہے، بھی زخمی ہوا اور اسے فوری طور پر ہسپتال منتقل کیا گیا۔ اس واقعے پر ایس ایچ او تھانہ باڑہ نے کہا کہ انہیں اس سے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی گئی، اور ممکن ہے کہ ڈی پی او یا ایس پی نے مغرب خان کو احکامات دیے ہوں، لیکن تھانہ کو آگاہ نہیں کیا گیا۔ نوجوان کے اہل خانہ نے نعش ڈوگرہ ہسپتال منتقل کر کے ضروری کارروائی مکمل کی اور بعد ازاں احتجاج کے لیے باڑہ خیبر چوک لے آئے۔ مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے عابد آفریدی نے مطالبہ کیا کہ نوجوان کے قتل میں ملوث اہلکار مغرب خان اور اس کی ٹیم کے خلاف قتل کی دفعات 302 کے تحت ایف آئی آر درج کی جائے اور انہیں گرفتار کیا جائے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر ان کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو احتجاج جاری رہے گا۔

(منظور آفریدی)

ماورائے عدالت قتل کیا گیا

خیبر تحصیل جمرود مین بازار میں پاک افغان شاہراہ پر تھانہ جمرود کے سامنے نعمان آفریدی کے لواحقین نے احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے نعمان کے والد واحد شاہ نے میڈیا کو بیان دیتے ہوئے الزام عائد کیا ہے کہ نعمان آفریدی کو مبینہ طور پر ماورائے عدالت قتل کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کچھ روز پہلے زمینی تنازع پر مخالفین کے ساتھ فائرنگ ہوئی تھی جس پر دونوں فریقین سے چھ افراد ایس ایچ او جمرود کے حوالے کئے تھے جس میں نعمان بھی شامل تھا۔ باقی افراد تھانہ جمرود میں ہیں جبکہ میرے بیٹے نعمان کی لاش پشاور سے ملی ہے۔ ایس ایچ او جمرود پر الزام ہوئے کہا ہے کہ بیٹے کی رہائی کے لئے ان سے ایک کروڑ سے زائد رقم بھی مانگی گئی تھی مظاہرین کا کہنا ہے کہ مقتول نعمان آفریدی کو انصاف فراہم کیا جائے اور واقعے کی شفاف تحقیقات کرائی جائیں۔ احتجاجی مظاہرے کے دوران مشتعل افراد نے جمرود تحصیل گیٹ کے قریب پتھراؤ کیا اور شدید نعرے بازی کی۔ لواحقین نے نعمان آفریدی کی لاش سڑک پر رکھ کر دھرنا دیا جس کے باعث شاہراہ پر ٹریفک کی آمد و رفت معطل ہوگئی اور گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ گئیں۔ لواحقین کا مؤقف ہے کہ یہ واقعہ ماورائے عدالت قتل ہے اور ذمہ داران کے خلاف فوری کارروائی کی جائے۔ مظاہرین نے حکومتِ وقت اور اعلیٰ حکام سے نوٹس لینے اور غیر جانبدارانہ انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔

(مسعود شاہ)

مارٹر شیلنگ اور ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری

خیبر وادی تیراہ، اکاخیل میں مارٹر شیلنگ اور ڈرون حملوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ رمضان المبارک کا مقدس مہینہ بھی یہاں کے مظلوم عوام کے لیے سکون نہ لا سکا۔ گھر محفوظ نہیں، گلیاں محفوظ نہیں، حتیٰ کہ پانی ذخیرہ کرنے کی ٹینکیاں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ مویشی، جو غریب عوام کا واحد سہارا ہوتے ہیں، وہ بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ رہے ہیں۔ لوگ اپنے ہی گھروں میں محصور ہو چکے ہیں س۔ وادی تیراہ آکاخیل نے امن کی خاطر کئی نوجوان دیے، کئی بچے کھو دیے، کئی بزرگ سپردِ خاک کیے۔ متعدد آپریشن ہو چکے، مگر امن کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ ظلم تھما نہیں، جبر ختم نہیں ہوا۔ آخر کب تک؟ آخر کب تک یہ وادی جلتی رہے گی؟ آخر کب تک ماؤں کی گودیں اجڑتی رہیں گی؟ صوبائی حکومت، علاقائی اور قومی مشران سے اپیل ہے کہ فوری اور سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔ محض مذمتی بیانات کافی نہیں۔ یا تو ان مظلوم لوگوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کیا جائے یا اس جاری ظلم کو روکا جائے۔ تیراہ کے عوام کو بھی جینے کا حق دیا جائے۔

(منظور آفریدی)

☆انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:							
2-وقوعہ کب ہوا؟	سال			مہینہ		تاریخ	
3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں				محلّہ		
	ڈاک خانہ				تحصیل وضلع		
4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم ورواج سے تعلق ہے	ہاں				نہیں		
5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)							
6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل							
7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام		ولد/زوجہ		پیشہ		
8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی/سماجی حیثیت	بچہ/بچی	عورت/مرد	غریب/ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار		
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کارکن	دیگر (تخصیص کریں)			
9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت/زوجیت	عہدہ	پیشہ			
	-1						
	-2						
	-3						
10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد/افراد کی معاشی/سماجی حیثیت	بڑا جاگیردار/زمیندار/بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے/غریب آدمی	بااثر صلاحیت/سیاسی اثر ورسوخ				
11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی/ادارہ			
	-1						
	-2						
	-3						

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان وغیر جانبدار افراد کے کوائف وموقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق/رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار/پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں
14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ	

15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار/اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے/والوں کی رائے			
رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں/محلّہ	شہر/ضلع

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: .....

تاریخ: .....

نوٹ: اگر تفصیلات فارم پر نہ آ سکیں تو نمبر لکھ کر سادے کاغذ پر تفصیل درج کریں

☆تمام ساتھی جو انسانی حقوق کے حوالے سے رپورٹیں بھیجتے ہیں آئندہ اس فارم کی فوٹو کاپی پر کوائف لکھ کر بھیجیں

Human Rights Commission of Pakistan
جہدِ حق
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق جہدِ حق کے تمام قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ
یہ رسالہ مفت ہے۔ قارئین کو کسی قسم کی قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1: تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2: ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلی کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3: ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4: کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6: ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8: ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9: کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10: ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11: (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12: کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13: (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14: (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15: (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16: (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17: (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18: ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20: (1) ہر شخص کو پر امن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21: (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22: معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23: (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24: ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25: (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26: (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27: (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ - 28: ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29: (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30: اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
"ایوان جمہور" 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35864994-35838341 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15
کمپوز: جمال احمد سید رضا شاہ